کے اس زمانہ کے ڈوگرہ، نون، ملک امیر محمد خاں نواب کالا باغ اور جنرل موسیٰ خاں کی شخصیتوں پر تبصرہ بھی کیا ہے، شورش مرحوم کے ذہن اور حافظہ میں ماضی کے نہ جانے کتنے واقعات محفوظ تھے، سلسلۂ بیان میں ان کا اور بعض مشہور قومی و سیاسی رہنماؤں کا ذکر بھی آتا گیا ہے، یہ روزنامچہ ان کے پُر زور قلم اور دلچسپ انشا کی خصوصیات سے معمور ہے،

کسب معاش کا اسلامی نظریہ مرتبہ جناب حامد علی خاں صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر صفحات ۱۱۰، قیمت ۳ے، ناشر: ڈاکٹر عبدالحق شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی دہلی،

اس مختصر کتاب میں کسب معاش کا اسلامی نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس غرض سے وہ آیتیں اور حدیثیں مع ترجمہ و تشریح نقل کی گئی ہیں جن میں کسب معاش کی ضرورت و اہمیت، حلال و حرام میں امتیاز، جائز پیشے اختیار کرنے اور کاروبار میں دیانت داری، راست بازی اور خوش معاملگی کی ترغیب کی گئی ہے، اور ناپ تول میں کمی، ذخیرہ اندوزی اور خیانت وغیرہ کی مذمت بیان کی گئی ہے، آخر میں نمبروار ان احکام و ہدایات کا خلاصہ بھی تحریر کر دیا گیا ہے، جو کتاب میں درج آیتوں اور حدیثوں میں بیان ہوئے ہیں اور شروع میں اسلام کے فلاحِ انسانیت کے ضامن ہونے کا ذکر کر کے دکھایا گیا ہے، کہ اس نے عبادات کی طرح معیشت، معاشرت اور اخلاق و سیاست کے متعلق بھی ہدایات دی ہیں اور وہ حلال روزی کی طلب اور کسب معاش کو غیر ضروری قرار نہیں دیتا،

"ض"

جلد ۱۱۹ ماہ اگست ۱۹۷۶ء مطابق ماہ شعبان المعظم ۱۳۹۶ھ عدد ۲

مضامین

شذرات

ایک بار ایک عرب دوست سے باتیں ہو رہی تھیں، گفتگو کے دوران فلسفۂ سیاست، سیاسی افکار و خیالات اور نظام سلطنت پر بحث چھڑ گئی، کہنے لگے کہ اقوام عالم کے مصائب و مشکلات کا تنہا حل یہی ہے کہ دنیا کی سربراہی عربوں کے ہاتھ میں ہو، تاریخ نے ثابت کر دیا ہے کہ عربوں کی فرمانروائی خدا کے بندوں کے لئے رحمت تھی، ہر عقیدہ و خیال اور ہر ملت و مذہب کے لوگ اُن کے دورِ حکومت میں امن و امان اور راحت و اطمینان کے ساتھ رہتے تھے، آج اگر پھر نظام عالم اُن کے ہاتھ میں آجائے، اور وہ دنیا کی امامت کا منصب سنبھال لیں، تو شر و فتن، قتل و غارت اور ظلم و جور کا خاتمہ ہو جائے، اور مخلوق عدل و انصاف، اخوت و مساوات اور صداقت و امانت کے سایہ میں آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے لگے، اپنے ان خیالات کی تائید میں وہ تاریخ اسلام کے حوالے دینے لگے، اور مسلم فرمانرواؤں کی بے تعصبی اور رعایا پروری کے واقعات سنانے لگے، میں نے کہا ذرا دوسرے پہلو کا بھی خیال کیجئے، حالات کا ایک افسوسناک رُخ بھی ہے،

ان عرب دوست نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ صرف انھیں کے نہیں ہیں، بلکہ بہت سے عربوں کا یہی خیال ہے، اسلام سے پہلے نسلی برتری اور لسانی تفوق کا تصور عربوں میں عام تھا، اگرچہ وہ اقوام عالم کے درمیان کوئی وزن نہیں رکھتے تھے لیکن اس کے باوجود اپنے آپ کو سب سے بہتر سمجھتے تھے، اسلام نے آکر اُن کے غرور کا خاتمہ کر دیا کہ تم سب ایک ماں باپ کی اولاد ہو، اب عزت و شرافت کا معیار نسل و وطن کے بجائے اعمال ہیں، جو شخص زیادہ خدا ترس اور نیکوکار ہوگا، وہ زیادہ معزز سمجھا جائیگا، رومی و حبشی اگر ایمان و عمل صالح کی صفات سے متصف ہوں گے تو انھیں عجمی و قریشی پر فوقیت حاصل ہوگی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدینؓ کے دور میں انسانی شرافت کا یہی معیار رہا، اور بلال و صہیب و سلمان رضی اللہ عنہم، قریش کے سرداروں اور طائف کے رئیسوں سے بدرجہا زیادہ عزت و اکرام کے مستحق سمجھے گئے، انسانی مساوات کا

یہی جذبہ تھا جس کی بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے غسانی حکمران جبلہ کے مقابلہ میں ایک بدو کا خیال کیا، اور صاف کہدیا کہ تم نے اس غریب کو مکا لگایا ہے، تمھیں اپنی دست درازی کی سزا برداشت کرنی پڑے گی، جبلہ نے کہا میں بادشاہ ہوں، اور یہ ایک بازاری ہے، میرا اس کا کیا مقابلہ، حضرت عمر نے فرمایا، جاہلی غرور و نخوت کا زمانہ ختم ہوگیا، اسلام کی نظر میں امیر غریب سب برابر ہیں،

عدل و مساوات کے اس تصور نے عرب کے منتشر اور متحارب قبیلوں کو ایک متحد قوم بنا دیا، جس کی بدولت گلہ بان جہاں بان بن گئے، اور مفلس و کمزور بدوؤں نے قیصر و کسریٰ کے تخت الٹ دیئے، لیکن آگے چل کر عرب بھی نسل و وطن کے طلسم میں گرفتار ہوگئے، اس غیر اسلامی تخیل نے وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر دیا، دبی ہوئی قبائلی عصبیتیں ابھر آئیں، اور شہنشاہوں کی قباؤں کو چاک کرنے والے خود اپنے گریبان پھاڑنے لگے، اموی عہد کے آغاز ہی میں قبائلی اختلافات شروع ہوگئے تھے لیکن عام مسلمانوں کے دینی جذبات اور اسلامی مزاج میں بہت فرق نہیں آیا تھا، اس لئے بادشاہوں کی لڑائیوں میں بھی وہ جہاد کے جذبہ سے شریک ہوتے تھے، اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کی خاطر اپنی جانیں قربان کرتے تھے، مگر رفتہ رفتہ بادشاہت کا رنگ نمایاں ہونے لگا، اس انداز ملوکانہ نے ان کے جذبات سرد کر دیئے، قبائلی عصبیت بڑھتی رہی، اور بھائی بھائی کا گلا کاٹتا رہا، اس تعصب اور خانہ جنگی کا انجام یہ ہوا کہ اقتدار عربوں کے ہاتھ سے نکل گیا، اور ایسا نکلا کہ آج تک واپس نہ آیا،

عربوں کے باہمی اختلاف نے اُن کو حکومت و فرمانروائی سے محروم کر دیا، ایک زمانہ میں بحر و بر اُن کے زیر نگیں تھے، اور وہ سیاہ و سفید سب کے مالک تھے، تاریخ کے اوراق میں اُن کے عروج و زوال کی داستان درج ہے، مورخین نے اس کے علل و اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، چاہئے تھا کہ ان واقعات سے وہ سبق لیتے، اپنے دلوں کا غبار صاف کرتے، اور اپنی صفوں کا انتشار دور کر کے ایک متحد اور منظم قوم کی طرح دنیا کے سامنے آتے، دنیا طلبی اور جاہ پسندی کے بجائے ایثار و قربانی سے کام لیتے اور رشک و حسد اور عناد و دشمنی کے بجائے باہمی خلوص و محبت، اور ہمدردی و خیرسگالی کے جذبات کے ساتھ ایک دوسرے کی

مدد کرتے، ایسا ہوتا تو پانسہ پلٹ جاتا، اور ہاری ہوئی بازی جیت لیتے، لیکن اس تباہی و بربادی اور رسوائی و زبون حالی کے باوجود اب بھی ان کے درمیان اتحاد و اتفاق مفقود ہے، دشمن کی تلوار سر پر لٹک رہی ہے، اُن کے بہترین علاقے اس کے قبضہ میں ہیں، آئے دن اُن کی عزت و ناموس پر حملے ہوتے ہیں، اور جان و مال کا نقصان ہوتا رہتا ہے، مگر پھر بھی اُن کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے بجائے اپنے ہی بھائیوں کو توپ و تفنگ کا نشانہ بنا رہے ہیں، لبنان کے دردناک واقعات اُن کی بے حمیتی کی افسوسناک مثال ہیں، کیا غضب ہے کہ اسرائیل نے جو کچھ کیا اس سے بڑھ کر آج عرب عربوں کے ساتھ کر رہے ہیں،

اس موقع پر تقسیم فلسطین کا زمانہ یاد آرہا ہے اس زمانہ میں میں اخبار خلافت کے شعبۂ ادارت سے وابستہ تھا تقسیم کا اعلان ہو چکا تھا، اور چند دن میں اس پر عمل درآمد ہونے والا تھا، برطانیہ اپنا تسلط اٹھا رہا تھا، اور اسرائیل اس کی جگہ حکومت سنبھالنے کی تیاری میں مصروف تھا، آئندہ برطانوی افواج کے بجائے اسرائیل کو اپنے علاقہ کی حفاظت کرنی تھی، خبریں آرہی تھیں کہ اسرائیلی سرحد سے متصل عراق، شام، اردن، مصر اور لبنان کی مسلح فوجیں کھڑی ہیں، اور منتظر ہیں کہ جیسے ہی برطانوی پرچم اتر کر اسرائیلی جھنڈا نصب ہو، اسرائیل کے علاقہ میں داخل ہو جائیں، یہ خبریں پڑھ پڑھ کر لوگ تعجب کر رہے تھے، کہ اسرائیل کس بل بوتے پر عربوں کی متحدہ فوجی طاقت کا مقابلہ کرے گا، عام خیال یہ تھا کہ شاید دنوں میں نہیں بلکہ گھنٹوں میں اسرائیل کا قلع قمع ہو جائیگا، لیکن آج چالیس برس سے زیادہ ہو گئے، اسرائیلی سلطنت نہ صرف قائم ہے، بلکہ اُس نے اپنی حدود اور وسیع کرلی ہیں، اور مزید پیش قدمی کے لئے تیار ہے، عرب چار لڑائیاں لڑ چکے ہیں، مگر کچھ پانے کے بجائے ہر بار ان کو مزید علاقے اسرائیل کے حوالے کرنے پڑے، اور یہ سب آپس کی نااتفاقی کی وجہ سے ہوا، افسوس ہے کہ اس مسلسل شکست اور جان و مال اور عزت و ناموس کے غیر معمولی نقصان کے بعد بھی اُنکی آنکھیں نہیں کھلیں، اور دشمن سے مقابلہ کے بجائے اپنے بھائیوں کی تاخت و تاراج میں مصروف ہیں،

مقالات

مغرب اقصیٰ (مراکش)

ماضی و حال کے آئینہ میں

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

ابھی کچھ عرصہ پہلے مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مراکش تشریف لے گئے تھے یہاں پہنچ کر ان کی چشم تصور کے سامنے تاریخ کے اوراق کھل گئے، اور عزم و حوصلہ فتح و ظفر، جہاں بانی و جہاں آرائی، تہذیب و تمدن، علم و فن اور ایمان و عمل کے جو مناظر انھیں نظر آئے انھوں نے صفحۂ قرطاس پر ان کی مرقع کشی کی کوشش کی ہے، انھوں نے اپنے خیالات عربی میں لکھے تھے، ان کے برادر زادہ مولوی محمد حسنی نے انھیں اردو کا جامہ پہنایا ہے، امید ہے کہ قارئین معارف کے حلقہ میں اسے دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ (معارف)

مجھے مشرق اسلامی کے اکثر ممالک کے سفر کا نوجوانی یا اس دور میں موقع ملا ہو جس کو ہم زندگی کی صبح یا ظہر سے تعبیر کر سکتے ہیں، لیکن اللہ تعالے کی حکمت و مشیت کہ اس دلنواز سرزمین کی زیارت کا موقع مجھے اس وقت ملا جب زندگی کا آفتاب مائل بہ غروب ہے۔

کاشانۂ اسلام میں مغرب اقصیٰ کا حصّہ

مغرب اقصیٰ (مراکش) کا یہ سفر جسمانی طور پر اور مہینوں اور

سالوں کے حساب سے ضرور تاخیر کے ساتھ ہوا، لیکن اس سفرِ روحانی میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی جو علم و تحقیق اور اسلام کے اُس وسیع اور عالمگیر کتب خانہ کے سایہ میں ہوا جس میں مغرب اقصیٰ کا بڑا حصہ ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس میں اس کا ایک پورا شعبہ اور (corner) ہے، جس کا شمار اس کتب خانہ کے بہت اہم حصوں اور شعبوں میں ہے، میں نے اس کے حسین تصورات اور اس کی عظیم المرتبت ہستیوں اور سرآمدِ روزگار شخصیتوں کے ساتھ ایک زمانہ گزارا ہے، میں اس کے اہم شہروں، تاریخی مقامات، تاریخ ساز جامعات، سادہ و دلنواز مساجد، اس کی حکومتوں اور تہذیبوں، اس کی ہم جوئیوں اور سرفروشیوں، اس کے عروج و اقبال اور اس کی ناکامیوں و کامرانیوں کا مشاہدہ کرتا رہا ہوں، میں نے اس کی طویل تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا ہے، جو مختلف رنگوں اور اہم واقعات و انقلابات سے بھری ہوئی ہے، اور جس سے ہر زندہ، باعزت، غیور اور خود دار قوم گزرتی ہے، جس کا قوموں کی برادری میں کوئی مقام ہوتا ہے، جس کو اپنی دعوت اور اپنی شخصیت عزیز ہوتی ہے، جو ہر وقت دشمنوں اور مخالفوں کے نرغہ میں رہتی ہے، اور ہمت بلند رکھتی ہے،

فتح و کامرانی کا رباط

یورپ کے قرب اور عالم اسلام کے مغربی حدود کے آخری کنارہ پر واقع ہونے کی وجہ سے مغرب اقصیٰ کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمیشہ حالتِ تیاری میں اور ہمہ وقت چاق و چوبند رہے "رباط" جس کے معنی ہی سرحدوں کی پاسبانی اور ایثار و قربانی کے ہیں، دراصل مغرب اقصیٰ کے صرف ایک شہر کا نام نہیں جو آج اس کا پایۂ تخت ہے، بلکہ پورا مغرب اس لحاظ سے رباط ہے، اور تاریخ گواہی دے رہی ہے، کہ یہ ناکامی و ہزیمت کا "رباط" نہیں، فتح و کامرانی کا "رباط" ہے۔

اندلس کی یاد

مغرب ہی وہ اصل دروازہ تھا، جہاں سے طارق بن زیاد کی قیادت میں مجاہدین کا پہلا دستہ اندلس میں وارد ہوا، اور اسلام کے عروج و اقبال اور یورپ میں علم و عقل کی شعاعیں پھیلنے کا ذریعہ اور نقطۂ آغاز بنا، یہاں حکومت بھی تھی، تہذیب بھی، علم بھی، اور عقل بھی، یہ اندلس فاتحین اسلام کے خواب شیریں، شعراء متغزلین کی جنت نگاہ و فردوس گوش اور مورخوں اور جغرافیہ دانوں کے محبوب موضوع کی حیثیت سے ابھر کر دنیا کے نقشہ میں آیا، یہ ایک جنت ارضی تھی، جہاں علم کی گرم بازاری بلکہ حکمرانی و فرمانروائی تھی، جس کو علماء و شعراء نے اپنا نشیمن اور گلشن علم بنایا تھا، فقہ، شعر و ادب، فلسفہ، اور فن تعمیر میں اس کا ایک علٰحدہ اور مستقل مدرسۂ فکر اور مکتبِ خیال تھا، جہاں مرسیہ، بلنسیہ، جیان، شاطبہ، قرطبہ، اشبیلیہ، غرناطہ، مدینۃ الزہرا اور قصر الحمراء جیسے زندہ اور بولتے ہوئے شہر آباد تھے،

اندلس اپنی تاریخ کے مختلف ادوار میں مغرب اقصیٰ کا ممنون کرم رہ چکا ہے، اُس نے اندلس کو بار بار مدد اور کمک پہنچائی ہے، اور اس کی تاریخ کے تاریک ترین وقفوں میں مجاہدین و فاتحین اس کو عطا کیے ہیں جنھوں نے اس کو موت کے منہ سے بچایا اور اس کے ڈوبتے ہوئے سفینہ کو بھنور سے نکالا ہے، اور زندگی و قوت کی ایک نئی قسط اس کو بخشی ہے، ان میں خصوصیت کے ساتھ ہم سلطان یوسف بن تاشفین (معرکۂ زلاقہ ۴۷۹ھ کے خاص ہیرو اور فاتح) کا نام لے سکتے ہیں، یہ وہی سلطان ہے جس نے مراکش کا شہر تعمیر کیا، اس کے بعد معرکۂ مرج الحدید ۵۹۱ھ کے فاتح مجاہد جلیل ابو یوسف المنصور الموحدی کا نام آتا ہے، جنھوں نے اس فتح مبین کی خوشی میں رباط الفتح کے نام سے یہ شہر آباد کیا، اس کے بعد ہم مجاہد عظیم علی الشریف الحسنی (۱۰۶۲ھ-۱۰۷۵ھ) کا نام لے سکتے ہیں، جو

علوی سجلماسی سلاطین کے جد اکبر اور موجودہ حکمراں خاندان کے جد امجد ہیں، جنھوں نے اندلس کی سرحدوں کو جہاد کرتے ہوئے کئی بار عبور کیا، لیکن جب تخت سلطنت ان کو پیش کیا گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میں اپنے اس عمل کو کسی دنیوی منفعت سے آلودہ کرنا نہیں چاہتا۔

فردوس گم شدہ کا ایک جھونکا

مغرب اقصیٰ سے اندلس کی طرف اتنی جلد منتقل کی میں معافی چاہتا ہوں یہ نسیم جانفزا کا ایک جھونکا تھا جو اس فردوس گم شدہ سے جہاں کی خاک پاک میں مسلمانوں کے خون اور آنسو جذب ہیں، اور جس سرزمین پر اُن کی ذہانت و عبقریت انسانیت و شرافت اپنی اعلیٰ ترین شکل میں ظاہر ہوئی، اچانک یہاں آگیا، اور کچھ اس لیے بھی کہ اگر کوئی شخص تنگنائے جبل الطارق پر کھڑا ہو تو اندلس اس کو بالکل قریب نظر آئے گا اور ظاہر ہے کہ قرب مکانی میں جو بات اور اثر ہے وہ بعد مکانی میں کیسے ہو سکتا ہے؟

اسلام کی آفاقیت

مغرب اقصیٰ (یا مغرب اسلامی و عربی) جو قرن اول میں وجود میں آیا، اور برگ و بار لایا، اسلام کے پیغام کی جہاں گیری کا روشن ثبوت ہے، اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اقوام عالم کو ان کے تنگ دائرہ اور اس گوشۂ گمنامی سے (جہاں وہ برسوں سے یا صدیوں سے زندگی گزار رہی تھیں) ایک نئی اور کشادہ دنیا میں لے آتا ہے، انھیں خانہ جنگیوں اور قبائلی لڑائیوں نیز زندگی و کائنات کے محدود تصور سے نکال کر قافلہ انسانی کی رہبری ہی نہیں بلکہ اس کی قیادت و رہنمائی اور تہذیب انسانی کی تعمیر و تشکیل، علم کی ترقی اور انسانیت کے پیچیدہ مسائل سے دلچسپی کے وسیع میدان میں داخل کرتا ہے، یہ شمالی مغربی پٹی جو بیبیا سے بحر اٹلانٹک تک پھیلی ہوئی ہے، متمدن اور ترقی پذیر دنیا سے جو مختلف تحریکوں، تنظیموں، مذہبی اداروں، مدارس نگر سے معمور و آباد ہے بالکل جدا تھی بیرونی دنیا سے

اس کا کوئی تعلق نہ تھا، اس کا اگر روم شہنشاہی سے کوئی تعلق تھا، تو وہ صرف محدود عسکری بنیاد پر، نہ اس کی کوئی شخصیت تھی نہ اس کے پاس کوئی پیغام تھا، یہ ممالک جو طرابلس سے مراکش تک پھیلے ہوئے تھے چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں سخت جانی و سخت کوشی، سنگدلی اور سفاکی اور فاتحین کے خلاف مسلسل شورش و بغاوت میں مشہور تھے، یہاں تک کہ وہاں کے اصلی باشندے (ان اصحاب سے معافی چاہتے ہوئے جن کا ان نسلوں سے نسبی تعلق ہے) نخوت و غرور اور وحشیانہ سلوک میں ضرب المثل ہو گئے، اور بربر اور بربریت دنیا کی تمام زبانوں میں اس کے ہم معنی قرار پائی، ان قوموں میں ہمیں سوائے قبائلی لڑائیوں اور خانہ جنگیوں کے قدیم عادتوں سے وابستگی یا مخصوص قبائلی روایات کے کوئی اور مفید تعمیری و علمی سرگرمی مطلق نظر نہیں آتی، نہ ان کے پاس کوئی ترقی یافتہ زبان تھی، نہ اعلیٰ و نفیس تہذیب، نہ کوئی معقول مذہب، نہ مشہور شہر اور آبادیاں، عصر قدیم کا ان کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا، وہ بھی کھنڈروں اور شہروں کے ملبہ کے نیچے دفن تھا، یہ اس بات کی دلیل تھی کہ خوابیدہ اہلیتوں اور صلاحیتوں مخفی طاقتوں اور سوئے ہوئے جذبات کی تحریک اور اعلیٰ مقاصد، تعمیری کوششوں، انسانیت کے وسیع نقطۂ نظر اور نسل آدم کے لیے مادی وسائل اور قوتوں کے صحیح استعمال میں اسلام کا کیا حصہ ہے، اور اس کا رخ شر سے خیر کی طرف پھیر دینے کی کیسی صلاحیت اور قدرت اسکو حاصل ہے،

مغرب اقصیٰ کی بازیافت

جب اس دور دراز، گمنام اور مورخوں، جغرافیہ دانوں اور مصنفوں کی نظر سے مخفی و مستور گوشہ پر اسلام کی باد بہاری کا جھونکا آیا تو دیکھتے ہی دیکھتے، ایک نئی دنیا وجود میں آگئی جس میں ہر چیز نئی تھی،

یہاں، قیروان، فاس، مکناس، مراکش، رباط، سوسہ، سرقسطہ، بجایہ، تلمسان،

تونس جیسے شہر وجود میں آئے، جہاں حدیث وتفسیر، فقہ وتصوف، شعر وادب، نقد وتاریخ فلسفہ، وحکمت کے ائمہ اور نادرۂ روزگار محقق مفکر پیدا ہوئے، جن کا شمار کرنا مشکل ہے، یہاں جامع القرویین اور جامع الزیتونہ جیسے مدارس قائم ہوئے اور ان سے علوم وفنون کے ایسے ائمہ تیار ہوکر نکلے جن کے نقوش عربی زبان اور علوم اسلامیہ کے میدان میں ابھی تک باقی ہیں۔

مغرب اسلامی کو اپنی تاریخ میں متعدد سخت معرکے پیش آئے، کئی حکومتیں آئی گئیں، کئی خاندان بدلے، اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ اور ایک گھرانہ سے دوسرے گھرانہ تک منتقل ہوتا رہا، اور سلطنت کو سخت نشیب وفراز سے دوچار ہونا پڑا لیکن اس ملک نے اپنی اسلامی شخصیت مخصوص عربی طرز، اور علم وثقافت کے اعلیٰ ذوق کی ہمیشہ حفاظت کی، وہاں علم کی گرم بازاری مختصر وقفہ کے لیے بھی سرد نہیں پڑی، مساجد ومدارس برابر اپنا پیغام پہونچاتے اور اپنا کردار ادا کرتے رہے علماء ربانی، اہل حق اور مردان خدا کلمۂ حق کہنے، اور صراط مستقیم کی دعوت دیتے رہے، اس لحاظ سے یہ انقلابات اور تبدیلیاں سطحی اور وقتی تھیں، عرب قوم کے جوہر اصلی کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہونچا اور اس کی شخصیت اور ایمانی وعقیدہ پر کوئی اثر نہ پڑا، مذہب وہی مذہب رہا ثقافت وہی ثقافت، ذوق وہی ذوق۔

نئے معرکے اور نئی فتحمندیاں

آخر میں اسکو ایک ایسے سامراج یا زیادہ صحیح الفاظ میں فوج کشی سے سابقہ پڑا جو اس طرح کے بیرونی حملوں میں شاید سب سے زیادہ سنگین تھا، زیادہ ذہانت، دقت نظر اور منصوبہ بندی کے ساتھ بنایا گیا تھا، اور بہت دور رس اثرات کا حامل تھا، یہ فرانسیسی اقتدار تھا، جس کے ساتھ بعض موقعوں پر اسپینی سامراج بھی شامل ہوگیا تھا،

اس نو وارد سامراجیت میں عزم وارادہ بھی تھا، اور وضاحت وتعین بھی وہ جدید ترین اسلحہ سے لیس تھا، اور مکمل فکری ثقافتی، علمی وتہذیبی تباہ کاری کے درپے، جن وسائل اور جن طریقوں کو اس نے استعمال کیا اس میں نسلی امتیاز عرب اور بربر کی تفریق، اور قدیم تہذیب وثقافت کے احیاء کا جذبہ شامل تھا، جو لوگ عمر رسیدہ ہیں وہ الظہیر البربری[۱]، کو کبھی بھول نہیں سکتے جس نے ماقبل اسلام کے عہد کی طرف واپس جانے کی کھلم کھلا دعوت دی اور بربری زبان کے احیاء وترویج کا نعرہ لگایا یہ ایک گہری اور دور رس سازش تھی جو اسلامی وحدت بلکہ اسلامی وجود اور شخصیت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے کی گئی،

لیکن مغرب اسلامی نے ان تمام ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا پوری استقامت اور شعور وہوشمندی کے ساتھ مقابلہ کیا، ان بربر مسلمانوں نے ثابت کر دیا کہ ان کا ایمان عربوں کے ایمان سے اور دین اسلام پر ان کا فخر عربوں کے فخر ومسرت سے کسی طرح کم نہیں، مغرب اپنے دونوں بازوؤں (عرب اور بربر) کے ساتھ اس معرکہ سے کامیاب وبامراد ہوکر نکلا اپنی اسلامی عربی شخصیت اور اپنے عقیدہ اور زبان اپنی غیرت وخودداری کو برقرار رکھتے ہوئے اس نے اجنبی استعمار کو اپنے ملک سے بے دخل کردیا، فرانسیسی اور اسپینی ملک چھوڑ کر چلے گئے، اس طرح اس قوم نے پھر اس کا ثبوت دیا کہ وہ ہر قسم کے چیلنج اور وقت کے تمام خطرات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے یہ اس بات کی بھی دلیل تھی کہ اسلام اس کے رگ وریشہ میں سرایت کر گیا ہے، اور اس کے خون اور روح میں پیوست ہے، اور یہ اسلام کے اولین قافلہ سالاروں، اور شہسواروں کے اخلاص کی برکت تھی جنھوں نے سب سے پہلے اس سرزمین پر قدم رکھا، جنھوں نے پہلی بار بربر قوم کو عربوں کے اس خوانِ نعمت اور

---

[۱] مغرب نے شاہی فرمان کے لیے "ظہیر" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

برکت وسعادت میں شریک کیا، اور انسانیت کی دولت مشترکہ میں اُن کو پورا حصہ دیا اور یہ موقع اُن کو حاصل ہوا کہ وہ قوت ایمانی، اسلام پر فخر وعزت کے احساس، اس کے محاسن وفضائل سے آراستگی اور اللہ تعالے سے تقرب میں خود عربوں سے بھی آگے نکل جائیں۔ اللہ تعالے کا ارشاد ہے۔

یا ایھا الناس انا خلقناکم	اے لوگو، ہمنے تم کو ایک مرد اور
من ذکر و انثیٰ وجعلناکم	ایک عورت سے پیدا کیا، اور تم کو
شعوباً وقبائل لتعارفوا	قبیلوں اور قوموں میں تقسیم کیا تاکہ
ان اکرمکم عند اللہ	ایک دوسرے کی پہچان حاصل کرو
اتقاکم۔	بیشک تم میں سب سے معزز ومحترم
	اللہ کے نزدیک وہ ہے جو اس سے
	سب سے زیادہ ڈرنے والا اور لحاظ
	وادب کرنے والا ہے،

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں بڑی تعداد میں علماء وزہاد داعی الی اللہ اور صاحب دل درویش، باکمال علماء اور اہل درس اور مصنف اور صاحب قلم پیدا ہوئے اور دوست اسلام کے خوبصورت سانچہ میں اس طرح ڈھل گئے، جس طرح بلاد عجم کی بعض اور قومیں اسلام کے سانچے میں ڈھل گئی تھیں۔

عصر جدید کا نیا چیلنج آج مغرب اسلامی کو جو معرکہ درپیش ہے وہ اس کی تاریخ کے جنگی معرکوں سے زیادہ سخت اور سنگین ہے، وہ عہد آخر کے غیر ملکی سامراج اور بیرونی تسلط سے بھی زیادہ خطرناک اور مہلک ہے، اس لئے کہ گذشتہ معرکے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے

میدان جنگ کی کھلی ہوئی لڑائیاں تھیں، جن میں صرف اسلحہ کا استعمال ہوتا تھا، اور شجاعت وجوانمردی اور جان ومال کی قربانی فیصلہ کن طاقت تھی، اس کے مقابلہ کے لیے پوری قوم ایک فرد واحد کی طرح اٹھ کھڑی ہوتی تھی، اور اس کو کفر واسلام اور ملکیوں اور سامراجیوں کی جنگ سمجھا جاتا تھا۔

لیکن آج کی لڑائی ایک خاموش اور ٹھنڈی لڑائی ہے، بہت عمیق اور پس پردہ یہ اسلامی طرز فکر اور مغربی طرز فکر کی (اپنے وسیع تر مفہوم میں) لڑائی ہے یہ فکری معرکہ آرائی ہے جس کا خلاصہ ہم ان الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں کہ کیا یہ مسلم اقوام یا اسلامی ممالک اسلام کو ایک ایسے دین ومذہب کی حیثیت دینے پر تیار ہوں گے، جس کے اندر بنی نوع انسان کی فلاح وکامرانی کا پورا سامان موجود ہے، اور جو زندگی کے ہر شعبے میں واضح ہدایات دیتا ہے، ایک ایسا کامل دین جو انفرادی واجتماعی زندگی، تہذیب وتمدن نسل جدید کی تشکیل وتعمیر، اور تعلیمی سیاست میں اپنا مستقل بالذات اور علیحدہ منصوبہ رکھتا ہے، اور ہر اس مسئلہ میں جس سے اس کی روح مجروح ہوتی ہو، اور زندگی میں اس کے متعین کردہ مقاصد پورے نہ ہوتے ہوں مداخلت کرنے کا حق رکھتا ہے، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر احتساب کائنات، قافلہ انسانی کی رہنمائی وقیادت اور تمدن انسانی کی نگرانی، اور روح انسانیت کی حفاظت وپاسبانی اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے، کیا مسلم اقوام یا مسلم ممالک اسلام کو ایک ابدی اور عالمگیر دین کی حیثیت سے اختیار کریں گے جو زندگی وقوت سے بھرپور زمانہ کے ساتھ ہم آہنگ بلکہ زمانہ پر حکمران ہو، ہر مسئلہ حل کرتا ہو بلکہ اس کے پیدا ہونے سے پہلے ہی اس کا سدباب کرتا ہو اور اس کی پیش بندی اور انتظام کردیتا ہو کہ اُس کے معاشرہ میں اس قسم کے مسائل ہی پیدا نہ ہوں اور بالادستی ہمیشہ اس کی رہے،

یا وہ اسلام کو مجرد عقیدہ یا ایمان کی حیثیت دیں گے اور مذہب کو انسان کا پرائیویٹ معاملہ تصور کریں گے جس کا معاشرۂ انسانی، زندگی کی تشکیل، نظام تعلیم و تربیت اور نئی نسل کی نشو و نما اور ذہنی ساخت و پرداخت سے کوئی تعلق نہیں، اور نہ قانون سازی اور زندگی کے کسی معاملہ میں مداخلت کا اس کو کوئی حق ہے، ایک مسلمان اگر عقائد، عبادات نام و نسب قومیت، رسم و رواج، خاندانی و نسلی روایات اور پیدائش و موت کے مراسم کے لحاظ سے مسلمان رہنا چاہے، تو رہ سکتا ہے، پلاننگ (منصوبہ بندی) اسی طرح مغربی رہے گی جیسے پہلے تھی، تہذیب اپنے تمام خارجی و داخلی اور شخصی و اجتماعی مظاہر میں مغربی ہوگی، اقدار و معیار وہی رہیں گے جن پر مغرب کے فلاسفہ و مفکرین نے مہر تصدیق ثبت کر دی ہو، اور جن کو مغرب میں تقدیس و عظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو، اخلاق و معاملات وہی قابل قبول ہوں گے جو مغرب کے مادہ پرستانہ ماحول میں برتے جاتے ہیں اور جن پر مسیحیت کا برائے نام اثر ہے اور ٹکنالوجی اور اقتصادی رسہ کشی اور زور آزمائی کی مضبوط گرفت ہے۔

مغرب کی نئی ٹکنیک

ہر باخبر و دیدہ ور شخص محسوس کر سکتا ہے کہ مغرب نے اپنے طویل تجربوں سے جو اسلامی عقیدہ کی بیخ کنی اور مسلمانوں کو تبدیل مذہب پر مجبور کرنے کے سلسلہ میں (جس طرح اسپین میں ہوا) اس کو حاصل ہوئے پورا فائدہ اٹھایا ہے، اور اب اس نے تدریج عیسائیت کے محدود و تنگ خیال اور پرانے طریقۂ کار کو جو نئی نئی مشکلات کھڑی کرتا تھا، اور بعض وقت شدید ردعمل کا باعث بن جاتا تھا، بالکل خیرباد کہہ دیا ہے، اس کو چھوڑ کر اس نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ کہ مسلمانوں کو ان کی جداگانہ اسلامی شخصیت اور اس تہذیب سے محروم کر دیا جائے جو ان کے عقیدہ، قرآنی تعلیمات، اور

اسلامی اخلاق کے زیر سایہ پروان چڑھی ہے، اور اس میں دینی شعائر و فرائض کی ادائگی کی ہر ممکن سہولت کا خیال رکھا گیا ہے، اور جو طہارت کے خاص اسلامی مفہوم کی حامل ہے۔

اسلامی تمدن کے خلاف سازش

تمدن کی جڑیں نفس انسانی اور قوم کے جذبات اور احساسات میں بڑی گہری ہوتی ہیں، اور کسی ایسی قوم کو اس کی مخصوص تہذیب و تمدن سے جدا کرنے یا محروم کرنے کی کوشش (جو اس کے دین و شریعت کے سایہ میں پروان چڑھے ہوں، اور برگ و بار لائے ہوں اور جن کی تشکیل و تکمیل میں دینی ذوق، دینی مزاج، اور دینی رنگ کا بڑا حصہ ہو) اس کو سرچشمۂ حیات سے محروم کر دینے کے مرادف ہے، اور اس کا مطلب اس قوم کو عقائد و خیالات اور دینی مراسم کے محدود دائرہ میں بند کر دینا اور اس کا رشتہ ماضی سے کاٹ دینا ہے، تاریخ بتاتی ہے کہ اس تغیر و انقلاب کا اثر اقوام عالم اور انسانی سوسائیٹیوں کی زندگی پر ہمیشہ بہت گہرا پڑا اور وہ آہستہ آہستہ ان قوموں کے تہذیبی سانچہ میں ڈھل گئیں یا ان کی تہذیب کے تیز دھارے میں مل گئیں جن کی تہذیب و ثقافت سے (اس کے وسیع مفہوم میں) انھوں نے استفادہ کیا تھا، اور بالآخر وہ اس عقیدہ سے بھی دست بردار ہو گئیں جسکو ابھی تک وہ اپنے سینہ سے لگائے ہوئے تھیں اور اس میں ان کو زیادہ دشواری پیش نہ آئی۔

نئے سوالات نئے مسائل

تہذیب مغرب کے خطرہ پر اس قدر زور دینے اور اسلامی شخصیت اور ملت مسلم کے وجود، مغرب سے استفادہ و اقتباس کے مضر اثرات کے بار بار ذکر سے مقصود یہ نہیں ہے کہ زندگی کی وہ سہولتیں، مفید و صالح وسائل، اور راحت رسانی و رفاہ عام کے وہ سامان و اسباب جو تہذیب مغرب نے فراہم کئے ہیں، قابل اجتناب ہیں، اور یہ دروازہ بالکل بند کر دینا چاہئے، اس لئے کہ یہ بات کوئی سمجھدار آدمی

(اور خاص طور پر وہ شخص جو دین کی روح اور دینی تعلیمات سے واقف ہے، اور جانتا ہے،
کہ اسلام اس معاملہ میں ہمیشہ سے بہت روادار کشادہ قلب اور وسیع النظر ہے) کبھی
نہیں کہہ سکتا، لیکن اس موقع پر مغربی تہذیب کا مفہوم وموضوع، اسباب ووسائل ایجادات
وآلات اور روزمرہ زندگی کے مفید اور کارآمد تجربوں سے زیادہ وسیع وعمیق ہے، اس سے
مراد وہ تمام افکار واقدار، معیار وپیمانے زندگی کو مغربی رنگ میں رنگنا، شہروں کی ہمہ گیر اور
از سر نو منصوبہ بندی، نیز زندگی کے وہ آداب اور انداز واطوار ہیں، جو اسلام کی تعلیمات
اور طہارت ونظافت، اعتدال وتوازن، میانہ روی وتوسط کے اس کے اپنے معیار
کے منافی ہیں، اور شریعت کی مقرر کردہ حدود کی پابندی پر پورے نہیں اترتے، اس
مغربی طرز زندگی اور طرز معاشرت کے ساتھ ایک مسلمان کے لئے آداب شریعت کا
لحاظ اور بہت سی سنتوں پر عمل نہایت دشوار ہے. اس کی وجہ سے وہ اس صحیح اسلامی
زندگی سے (جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام اور تابعین عظام
نے گزاری تھی) بہت دور ہوتا جاتا ہے، اس مغربی تہذیب وتمدن کو اختیار کرنے کے بعد
پوری قوم ایک نئی شخصیت کی حامل ہو جاتی ہے، اور اس کی شناخت صرف اسلامی
ناموں اور قومی ومقامی لباسوں سے ہو سکتی ہے، (جن کا رواج بعض مشرقی ممالک میں
ابھی تک باقی ہے) یا اس وقت اس کے مسلمان ہونے کا احساس ہوتا ہے، جب وہاں کی
مسجدوں سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے، یا جب آپ وہاں کسی مسجد میں داخل ہوتے
ہیں، اور اس ملک کے حالات کے مطابق آپ کو نمازی نظر آتے ہیں کہیں کم اور کہیں زیادہ؟
ان ملکوں کا اسلام سے رشتہ عقائد ومراسم کے ایک کمزور دھاگہ سے بندھا ہوا، ہوتا ہے،
جو خدانخواستہ کبھی ٹوٹ جائے تو ہر چیز کا خاتمہ ہے۔

صحیح مکمل اسلامی تہذیب کی طرف

مجھے یقین ہے، کہ ایک طرف عصر جدید کی فراہم کردہ سہولتوں
اور علم جدید کے بخشے ہوئے عطیوں اور دوسری طرف تہذیب اسلامی کے حسن، سادگی، سنجیدگی، طہارت و
نظافت خصوصی اعتنا، اسراف وتبذیر، ظاہری مظاہر اور غیر ضروری زیبائش وآرائش
سے اجتناب دونوں چیزوں کو باآسانی جمع کرنا ممکن ہے، لیکن ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب
اسلامی حکومتیں یا اسلامی معاشرہ ایک جدید، خود کفیل، اور مستقل بالذات پلاننگ و
منصوبہ بندی کے لیے اپنے کو آمادہ کرے جو اندھی تقلید، بلا سوچے سمجھے عجلت کے ساتھ اقدام
اور احساس کمتری سے آزاد اور پاک ہو اور اس کے پاس ذہانت آزادانہ فکر وبصیرت
خود نگری وخود اعتمادی، اور اسلامی تعلیمات اور اسلامی تہذیب کی بالادستی اور برتری
پر یقین کامل کا سرمایہ ہو، اس شکل میں یہ منصوبہ بندی اور معاشرہ کی تعمیر نو کا خاکہ اپنے
سابق اور مستعار نقشہ سے زیادہ جاذب نظر دلآویز اور زیادہ لائق احترام ہوگا اور یہ
منصوبہ بند اسلامی شہر نہ صرف سیاحوں کا مرکز ہوں گے بلکہ اس سے بڑی تعداد میں
اہل علم ان کو دیکھنے کے لیے آئیں گے، اور شائستہ تہذیب کا یہ حسین ودلچسپ نمونہ یا طرز نو
متعدد مغربی ممالک کو اس پر آمادہ کر سکے گا، کہ وہ اس کے بعض پہلوؤں کی اپنے ہاں نقل کریں
اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں یا کم از کم اس پر غور کرنے اور اس کا احترام
کرنے پر مجبور ہوں جیسا کہ ایک زمانہ میں اندلس کی اسلامی تہذیب کے ساتھ پیش آیا تھا
اور مغربی تہذیب کے فلسفہ وادب پر اس نے گہرے نقوش چھوڑے تھے۔

تہذیب مغرب کا ناقص ایڈیشن

لیکن افسوس کی بات ہے کہ کسی مشرقی مسلم ملک اور
کسی مسلم حکومت کو اس کی بھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ محض تجربہ کے طور پر اس کی کوشش کرتا
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ ممالک آج مغربی تہذیب کا ایک ناقص ونا تمام ایڈیشن یا اس کی

ایک ایسی دھندلی اور مٹی ہوئی تصویر ہیں، جو مغربیوں کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتی، اور اُن کے اندر اُسے دیکھ کر احترام کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا جب وہ ان شہروں میں سیاحت و تفریح کی غرض سے وارد ہوتے ہیں، تو اس نقالی یا حسنِ "مستعار" کو دیکھ کر کہتے ہیں، (بضاعتنا رُدّت الینا) یہ تو ہمارا ہی سامان ہے جو ہمیں لوٹا دیا گیا ہے،

تعلیم و ثقافت کی نئی قومی پالیسی

اس سے زیادہ خطرہ کی بات تعلیم و ثقافت اور اعلام (اطلاع و ابلاغ و قومی رہنمائی) کی نئی قومی پالیسی ہے، جس سے زیادہ طاقتور، موثر اور زود اثر نسخہ (بالخصوص نئی نسل کی تشکیلِ جدید میں) اب تک دریافت نہیں ہوا، وہ ایک ہی وقت میں دایہ بھی ہے، مکتب کا استاد بھی، معلم و مربی بھی، اور زعیم و رہنما بھی، وہ ایک مخصوص ایمان و عقیدہ اور افکار و اقدار پر ایمان رکھنے والی قوم کو آسانی کے ساتھ تراش خراش کے ایک نئی قوم بنا سکتا ہے، جو اپنے آبا و اجداد سے صرف خون و نسل کا یا زبان کا تعلق رکھتی ہے، بلکہ اس کو ایک ایسی باغی قوم بنا دیتا ہے جو ان عقائد، مسلمات و مبادی اور ان اخلاقی اقدار سے جنگ کرنا، اُس کو تباہ و برباد کرنا اس کے ملبہ کو راستہ سے ہٹانا، اور باقی ماندہ آثار کو مٹانا اپنا فرض سمجھتی ہیں، خواہ اس تخریبی اور سلبی عمل پر اس کی ساری توانائیاں، ذہانتیں اور صلاحیتیں صرف ہو جائیں اور پورا ملک اور معاشرہ ایک خونریز خانہ جنگی میں مبتلا ہو جائے جو بعض اوقات بیرونی حملہ اور غیر ملکی اقتدار سے کہیں بدتر اور کہیں زیادہ طویل ہوتی ہے،

یہ معنوی اور اخلاقی نسل کشی کسی قوم و ملت کے لیے جسمانی نسل کشی (Genocide) سے زیادہ خطرناک ہے، "نسلی قتل عام" کے وہ قدیم ترین علمبردار جو اپنے وحشیانہ سلوک اور درندگی و سفاکی میں ضرب المثل ہیں، اگر اس راز کو سمجھتے اور

یہ جدید وسائل استعمال کرتے تو اس قدر، ہرگز بدنام نہ ہوتے بلکہ شاید تاریخ ان کو بہت اچھے الفاظ سے یاد کرتی، اور اُن کو خلق پرور، علم نواز اور انسانیت دوست کہا جاتا۔

عالم اسلام کی موجودہ قیادت

عالم اسلام کی قیادتوں کی کہانی، ادھر نصف صدی کے اندر دراصل مسلم اقوام کے اسلامی و دینی مزاج سے گلو خلاصی کی اور ہر ممکن ذریعہ سے اس کی سرکوبی و بیخ کنی کی کہانی یا تاریخ ہے، یہ خون آشام جنگ اکثر اسلامی ممالک میں ناکامی و نامرادی پر ختم ہوئی، لیکن اس مدت میں اس نے ان قائدین کے بہترین قوائے ذہنی و علمی اور ان اقوام کی ساری توانائیوں اور صلاحیتوں کو بے دردی کے ساتھ نچوڑ لیا اور اس کا کوئی فائدہ ان کو نہ پہونچا، اگر حقیقت کے اعتراف اور قوم کی نبض شناسی کی بنیاد پر اس سے بہت تھوڑی کوشش کی جاتی تو قوم و ملک کو اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہونچتا، اور ان قائدین کے وقت اور صلاحیت کا بڑا حصہ ضائع ہونے سے محفوظ رہتا،

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی

الجزائر کی جنگ آزادی (جس میں جوش ایمانی اور غیرت ملی کا پورا پورا استعمال ہوا) نیز فرماں روائے مغرب کا امن مارچ (Gren march) (جو نومبر ۱۹۷۵ء میں بڑی حکمت و قابلیت کے ساتھ شروع ہوا، اور اُس کی کامیابی کی صدائے بازگشت ساری دنیا میں سنی گئی) اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ یہ امت صرف اس بات پر لبیک کہتی ہے، اور اس تحریک کے لیے سرفروشی و جان سپاری کے لیے آمادہ ہوتی ہے، جو دینی رنگ کی حامل ہو، جو اس کے دل کے مضراب کو چھیڑ دے، اور اس کے سوائے ہوئے ایمانی جذبات کو بیدار کر دے، وہ صرف ایمان و عقیدہ اور شوق و محبت کی زبان سمجھتی ہے، جس کو عقل سے پہلے اس کا دل سنتا ہے یہ تجربہ عالم اسلام کے مشرق و مغرب میں دسیوں بار کیا

کیا جا چکا ہے، اس لیے عقلِ عملی اور فطرتِ سلیمہ بلکہ عاقلانہ سیاست اور حکیمانہ قیادت کا بھی تقاضا ہے کہ یہ قیادتیں ان اقوام سے استفادہ کا یہ مختصر اور آسان طریقہ چھوڑ کر وہ پیچیدہ راستے اختیار نہ کریں جن کا ساتھ یہ قومیں بددلی سے اور مجبوری کی وجہ سے دیتی ہیں، اور ان کے مزاج کے ساتھ طاقت آزمائی اور اُس کو بدلنے کی سعی لاحاصل میں ان قیادتوں اور خود ان اقوام کا بڑا قیمتی وقت برباد ہوتا ہے، اور وہ کوششیں کوہ کندن و کاہ بر آوردن کے مرادف ثابت ہوتی ہیں، اس لیے کہ۔ ع

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

اور جیسا کہ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

ومکلف الایام ضد طباعہا ... متطلب فی الماء جذوۃ نار[1]

مجرمانہ سستی، اور غیر ضروری رواداری | ان قیادتوں میں وہ قیادتیں بھی ہیں، جن کے دل میں اسلام کا احترام ہے، اور وہ اپنے دائرہ اختیار اور دائرہ اثر میں اسلامی احکام نافذ کرنا چاہتی ہیں، اور ان کو اپنے عوام کا اعتماد اور احترام بھی حاصل ہے لیکن وہ سستی و غفلت، کاموں کو ملتوی کرنے کی عادت، ارادہ اور فیصلہ کی کمزوری، اور اسلام دشمن عنصر کے ساتھ غیر ضروری رواداری کا شکار ہیں، وہ ان عناصر کو اپنے تعلیمی نظام، اعلام (Information) صحافت اور پریس میں کام کرنے کا موقع دیتی ہیں اور اس کا نتیجہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عناصر ان کمزور قیادتوں کو راستے سے ہٹا کر اقتدار پر پہلی فرصت میں قابض ہونا چاہتے ہیں اور رفتہ رفتہ ملک کے پورے انتظامی ڈھانچہ پر اپنی گرفت مستحکم کر لیتے ہیں، مسلم اقوام ان بے دین، لامذہب اور کمیونسٹ طالع آزماؤں کے

[1] زمانہ کو اسکے مزاج اور رفتار کے خلاف کسی چیز پر مجبور کرنا ایسا ہے جیسے کوئی پانی میں آگ کا شعلہ تلاش کرے۔

رحم و کرم پر ہوتی ہے، اور ان مقاصد اور اُس طرز زندگی کی طرف اس کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہنکایا جاتا ہے، جن سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا، وہ سب کچھ دیکھتی ہیں، لیکن کچھ کر نہیں سکتی ہیں۔

یہ صرف ان مسلم قائدین کی سستی و سہل انگاری، مواقع ضائع کرنے کی عادت، اور اپنے دشمنوں اور اسلام کے دشمنوں کو بہتر سے بہتر مواقع فراہم کرنے کا مزاج ہے جس کا خمیازہ بھی خود اُن ہی کو بھگتنا پڑتا ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ مغرب اسلامی ان تلخ و سنگین تجربوں سے جو ممالک اسلامیہ کی تاریخ میں بار بار کیے گئے، اور خاص طور پر ماضی قریب کے ان واقعات سے جو روز روشن کی طرح عیاں ہیں پورا فائدہ اٹھائے گا، اور وہ مہلک غلطی نہ کرے گا، اس لیے کہ حدیث شریف میں آتا ہے۔

السعید من وعظ بغیرہ ... خوش نصیب وہ ہے، جو دوسروں سے سبق حاصل کرے۔

دگر دانائے راز آید کہ ناید | آج مسلم ممالک اور مسلم اقوام کو ان سر پر منڈلاتے ہوئے مہیب خطروں سے اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ باہمت، عالی حوصلہ اور ارجمند و اقبال مند قائد و رہنما ہے، جو اپنے عقیدہ اور اصول کی خاطر اپنی لذت و راحت کو قربان کر سکے اور نفس کے تمام مرغوبات (مثلاً آرام و آسائش، مدح و توصیف، ملک و مال اور جاہ و اقتدار) پر غالب آسکے اور واقعہ یہ ہے کہ ایمان اور اللہ کے مظلوم و مغلوب بندوں کی انسان نما درندوں سے گلو خلاصی اسلام کی حمایت اور مسلمانوں کی پاسبانی، اُن کے مستقبل کی ضمانت، خدا کی خوشنودی اور رضا، اور جماعتِ مجاہدین و مجددین میں شمولیت سے بڑھ کر

عزت اور لذت کسی اور چیز میں نہیں، اللہ تعالیٰ کی سنت ہے، کہ اس طرح کے کارگزار و وفا شعار بندوں کو جو کسی آڑے وقت میں اسلام اور مسلمانوں کے پشت پناہ ہوتے ہیں عزت و سرخروئی، قبولیت و مقبولیت، فیض عام اور نقش دوام، دلوں پر حکمرانی اور محبوبیت و نیکنامی کا وہ انعام عظیم اور "حیات جاودانی" عطا فرماتا ہے، جس کے سامنے دولت دنیا کے پجاریوں جھوٹی اور وقتی شہرت کے طلب گاروں اور مصنوعی عزت کے خریداروں کی یہ "متاع فانی" کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

مغرب اسلامی کے ان تمام بھائیوں کو جنھوں نے انتہائی خلوص و گرم جوشی کے ساتھ ہمارا ہر جگہ استقبال کیا اور اپنی اسلامی اخوت اور روایتی عربی مہمان نوازی کا بڑھ چڑھ کر مظاہرہ کیا، ہمارا سلام شوق پہونچے اس لیے کہ یہ چند دن جو ہم نے ان کے جوار میں اور اُن کے خوبصورت سرسبز و شاداب ملک میں گزارے، عمر کے ان حسین و خوشگوار دنوں میں ہیں جو انسان کے حافظہ سے کبھی محو نہیں ہوتے۔

اسلام اور عربی تمدن

شام کے مشہور فاضل اجل علامہ کرد علی کی کتاب "الاسلام والحضارۃ العربیہ" کا آزادانہ اردو ترجمہ مولانا شاہ معین الدین ندوی کے قلم سے جس میں یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے اخلاقی، علمی اور تہذیبی احسانات اور اس کے اثرات و نتائج کی تفصیل بیان کی گئی ہے، اور اسلامی تمدن و تہذیب پر علماء مغرب کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے۔

قیمت - ۷۵-۱۳

دیار پورب کا چوتھا علمی دور

از جناب مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اڈیٹر البلاغ، بمبئی،

دیار پورب کا چوتھا علمی دور نوابی اودھ کے قیام (۱۱۳۰ھ) سے اس کے خاتمہ (۱۲۷۳ھ) تک کل ۱۴۳ سال کا ہے، اس زمانہ میں ملک میں بے حد انتشار تھا، دہلی کی مرکزی حکومت بہت کمزور ہوگئی تھی، شاہ جہاں اور اورنگ زیب کے تخت پر محمد شاہ اور شاہ عالم جیسے نااہل اور عیش پسند بادشاہ بیٹھے تھے، جن کی حیثیت امراء اور وزراء کے ہاتھ میں کٹھ پتلی سے زیادہ نہ تھی، نادر شاہ کے ہاتھوں بادشاہ اور پایہ تخت کی جو درگت ہوئی اس سے مغل حکومت کی کمزوری و بے بسی بالکل عیاں ہوگئی، نادر شاہ کی واپسی کے بعد تورانی امراء کے مقابلہ میں ایرانی امراء کا دخل حکومت میں بڑھ گیا، اور سعادت علی برہان الملک وزیر الممالک ہوگئے، آگے چل کر اسی خاندان نے اودھ میں ایک نئی حکومت قائم کی، اس دور میں ان اطراف کی ساری علمی رونق سمٹ کر ایک مخصوص طبقہ میں محدود ہو کر رہ گئی، قدیم علمی و دینی خانوادے تباہ و برباد ہوگئے، ان کی جاگیریں اور معافیاں ضبط کر لی گئیں، وظائف بند کر دیئے گئے، اور مختلف طریقوں سے ان کو شیعہ بنایا گیا جس کے نتیجہ میں نیا علمی ماحول اور نئی مذہبی فضا قائم ہوئی،

نوابی اودھ میں حسب ذیل گیارہ حکمران گذرے ہیں

۱۔ نواب برہان الملک وزیر الممالک سعادت علی خان نیشاپوری متوفی ۱۰ ذوالحجہ ۱۱۵۱ھ

۲۔ نواب ابو المنصور صفدر جنگ، داماد نواب سعادت علی خان متوفی ۱۸ ذوالحجہ ۱۱۶۷ھ

۳۔ نواب شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ متوفی ۲۸ ربیع الاول ۱۱۸۹ھ

۴۔ نواب آصف الدولہ پسر شجاع الدولہ متوفی ۱۲۱۰ھ

۵۔ نواب مرزا علی خاں پسر آصف الدولہ، معزول و اسیر بنارس ۱۲۱۳ھ

۶۔ نواب سعادت علی خاں متوفی رجب ۱۲۲۹ھ

۷۔ نواب غازی الدین حیدر پسر سعادت علی خان متوفی ۲۰ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ

۸۔ نواب نصیر الدین حیدر پسر غازی الدین حیدر متوفی ۱۲۵۳ھ

۹۔ نواب نصیر الدولہ محمد علی شاہ برادر سعادت علی خان متوفی ۱۲۵۸ھ،

۱۰۔ نواب امجد علی شاہ پسر محمد علی شاہ، متوفی ۱۲۶۴ھ

۱۱۔ نواب واجد علی شاہ، معزول ۱۲۷۳ھ

یہ لوگ مذہباً شیعہ تھے، اور ان کے اثر سے اودھ میں شیعیت کو بڑا فروغ ہوا۔

ابتدا میں نوابی اودھ کا طول گورکھپور سے قنوج تک ۲۳۰ کوس اور عرض شمال میں ہمالیہ پہاڑ سے الہ آباد تک ۱۰۵ کوس تھا، اس کی مشرقی حد صوبہ بہار، مغربی حد قنوج، شمالی حد کوہستان، اور جنوبی حد مانک پور تک تھی، اس میں چار سرکاریں تھیں، (۱) سرکار گورکھپور، (۲) سرکار بہرائچ (۳) سرکار خیرآباد (۴) سرکار لکھنؤ، پوری مملکت میں ۱۹۰ محال تھے، اور سالانہ آمدنی ۲۶ کروڑ روپیہ تھی۔[1] مگر اس کی وسعت بعد میں سمٹتی گئی، تیسرے حکمران نواب شجاع الدولہ پسر صفدر جنگ ۱۱۶۷ھ میں اودھ اور الہ آباد کا حاکم ہوا، اسی زمانہ میں محمد شاہ عالم نے بکسر کی جنگ میں شرائط

[1] حدیقۃ الاقالیم ص ۵۰، مطبوعہ نولکشور،

صلح کی رو سے شہر غازی پور کو انگریزوں کے حوالہ کر دیا، اور چوتھے حکمراں نواب آصف الدولہ نے اپنے دور حکومت میں قرضہ کی ادائیگی میں غازی پور کے علاوہ جونپور، بنارس کے علاقے بھی انگریزوں کی تحویل میں دیدیے، اور چھٹے حکمراں نواب سعادت علی کے دور میں لارڈ ولزلی سے صلحنامہ کی رو سے ۲ رجب ۱۲۱۶ھ (۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء) میں چکلہ اعظم گڈھ، پرگنہ ماہل، پرگنہ مئوناتھ بھنجن کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت میں شامل کر کے ضلع گورکھپور میں داخل کر دیا گیا۔[1] مذکورہ بالا معاہدہ سے انگریزوں نے یہ فائدہ اٹھانا چاہا کہ نواب سعادت علی خاں ۷۶ لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرے نیز یہ کہ قلعہ انگریزوں کے حوالہ کیا جائے جس میں دس ہزار انگریزی فوج رہے گی، نواب مذکور نے ان شرائط سے انکار کر کے تخت چھوڑنا چاہا، مگر لارڈ ولزلی اپنی ضد پر اڑا رہا، یہاں تک کہ مذکورہ بالا علاقے انگریزوں کے حوالہ کرنے پڑے، ان علاقوں سے اس زمانہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سالانہ آمدنی ایک کروڑ ۳۵ لاکھ ۸۳۰۹۷ روپیہ ۱۲ آنے ۳ پائی تھی، جس میں اعظم گڈھ وغیرہ سے ۴۲۲۷۹۵ روپیہ ۶ آنے ۸ پائی حاصل ہوئے تھے،[2]

اس قسم کی تفصیلات ہمارے موضوع سے باہر ہیں، البتہ ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نوابانِ اودھ کا دور سیاسی اور ملکی حوادث و فتن سے پُر تھا، انگریزوں کے ایسے ہوشیار حریف کی ریشہ دوانیوں کے باوجود یہ عیش و عشرت میں مدہوش تھے، کبھی خواب غفلت سے بیدار ہوتے تو شراب و کباب کے داغ مذہبی دلچسپیوں سے دھونے کی کوشش کرتے، مگر مذہب کی حقیقی تعلیمات پر عمل کی بجائے مذہبی مراسم کی نمائش سے عوام کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے، طاقتور حریف سر پر تھا، مگر اس ملت کو متحد رکھنے کے بجائے شیعیت کی تبلیغ سے سنیوں کو بیزار کر رہے تھے، اور اس میں بھی حکیمانہ طرز پر دعوت کے بجائے ترغیب و ترہیب سے کام لیتے تھے، ان کی اس روش نے

[1] اعظم گڈھ گزیٹیر ص ۱۲۳، ۱۹۱۱ء [2] تاریخ اودھ مولوی نجم الغنی ج ۴ ص ۵۴۔

اودھ کی علمی زندگی کو تہس نہس کر دیا اور علماء و مشائخ کے پرانے خاندان تباہ ہو گئے،

علم و علماء کی تباہی

دیارِ پورب کی صبحِ بہار کی رنگین و حسین داستان مولانا غلام علی آزاد بلگرامی نے مزے لے کر سنائی ہے، اب ان ہی کی زبانی شام اودھ کی بے کیف کہانی بھی سننی چاہیے، جو اس کے عینی شاہد بھی ہیں، وہ لکھتے ہیں۔

و تا حدود ۱۱۳۰ھ ثلاثین و مائۃ و الف ہنگامۂ علم و علماء درین گل زمین گرمی داشت، تا آنکہ برہان الملک سعادت علی خان نیشاپوری در آغاز جلوس محمد شاہ حاکم صوبۂ اودھ شد، و اکثر بلاد عمدۂ صوبۂ الٰہ آباد، نیز مثل دار الخیور، جونپور و بنارس و غازی پور، و کڑہ مانک پور و کوڑہ جہان آباد، وغیرہا ضمیمۂ حکومت گردید، و وظائف و سیور غالات خانوادہائے قدیم و جدید یکقلم ضبط شد و کار شرفا و نجبا بہ پریشانی کشید، و اضطراب و اضطرار معاش مردم آنجا، از کسب علم باز داشتہ و پیشۂ سپاہگری انداخت و رواج تدریس و تحصیل از درجہ ماند و مدارس از عہد قدیم

۱۱۳۰ھ تک اس سرزمین رنگ و بو کی مٹی میں علم و علماء کی گرمی باقی رہی، یہاں تک کہ محمد شاہ عالم کے آغاز جلوس میں برہان الملک سعادت علی خان نیشاپوری صوبۂ اودھ کا حاکم ہوا تو اس نے صوبۂ الٰہ آباد کے اکثر بڑے بڑے شہروں کو بھی جیسے دار الخیور جونپور، بنارس، غازی پور، کڑا مانک پور، کوڑا جہان آباد، وغیرہ کو اپنی حکومت میں شامل کر کے قدیم و جدید خاندانوں کے وظائف اور جاگیریں اور معافیاں یکقلم ضبط کر لیں جس کی وجہ سے شرفاء و نجباء نے بڑی پریشانی اٹھائی اور معاشی تنگی و پریشانی نے اس دیار کے لوگوں کو حصول علم سے نکر پیشۂ سپہ گری میں ڈال دیا،

معدن علم و فضل بود یکقلم خراب افتاد، و انجمن ہائے ارباب کمال بیشتر برہم خورد انا للہ و انا الیہ راجعون،
و بعد ارتحال برہان الملک نوبت بہ خواہرزادۂ او ابو المنصور صفدر جنگ رسید، و وظائف و انقطاعات بدستور زیر ضبط ماند، و در آخر عہد محمد شاہ ۱۱۵۹ھ تسع و خمسین و مائۃ و الف صوبہ داری الٰہ آباد نیز بہ صفدر جنگ مقرر شد و تتمۂ وظائف آن صوبہ کہ تا حال از آفت ضبط محفوظ ماندہ بود بہ ضبط درآمد و در عہد احمد شاہ صفدر جنگ بہ پایۂ وزارت اعلیٰ صعود نمود، و نائب صوبہ کار بر ارباب وظائف تنگ تر گرفت و تا حین تحریر کتاب این دیار پامال حوادث روزگار است لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا۔[1]

اور تعلیم و تدریس کا رواج یوں ختم ہو گیا کہ جو مدرسے عہد قدیم سے معدن علم و فضل تھے بالکل ویران ہو گئے اور اکثر با کمالوں کی محفلیں اجڑ گئیں، انا للہ و انا الیہ راجعون
برہان الملک کے مرنے پر اس کے بھانجے ابو المنصور صفدر جنگ کو یہاں کی حکومت ملی اس کے دور میں بھی وظائف اور جاگیریں بدستور سابق ضبط رہیں، ۱۱۵۹ھ میں محمد شاہ عالم کے آخری عہد میں الٰہ آباد کی صوبہ داری بھی صفدر جنگ کے حوالہ کر دی گئی تو جو وظائف اب تک باقی تھے، وہ بھی نہ رہ سکے بلکہ سب ضبط کر لئے گئے، اور احمد شاہ کے دور میں صفدر جنگ وزیر اعلیٰ بنا تو نائب صوبہ دار نے وظیفہ یاب خاندانوں پر سختی کی اور اس کتاب مآثر الکرام کی تصنیف کے وقت ۱۱۶۸ھ تک یہ دیار حوادث زمانہ سے پامال و برباد اور تباہ حال ہے لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا،

اس ضمن کی لئے دوسرے عینی شاہد اور اس تباہی و بربادی سے گذرنے والے مولوی

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۲،

خیر الدین محمد شیعی الہ آبادی جون پوری کا بیان کافی ہے۔ وہ اس دور کے سرد و گرم حالات سے دوچار ہوئے ہیں، جہاندار شاہ کی خدمت میں رہے ہیں، ایسٹ انڈیا کی ملازمت کی ہے، نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ جاچکے ہیں، الہ آباد اور جون پور میں تعلیمی خدمت انجام دی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب تذکرۃ العلماء (تالیف ۱۲۱۴ھ) میں جون پور وغیرہ کے اہل علم و فضل کی تباہی و بربادی کا حال درج کیا ہے، ہم اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں، لکھتے ہیں، کہ محمد شاہ کے عہد سلطنت میں نواب برہان الملک سعادت علی خاں نیشاپوری صوبہ اودھ اور سرکارات بنارس و جون پور کا حاکم ہوا، نواب مذکور صوبۂ اودھ کا انتظام کرنے کے بعد ۱۱۴۷ھ میں جون پور آیا، چونکہ اس شہر کے مشائخ، امراء و حکام کی حاشیہ نشینی کے عادی نہیں تھے، اس لئے ان میں سے کوئی اس کے در دولت پر حاضر نہیں ہوا، ایک دن نواب مخدوم الملک شیخ غلام غوث کی ملاقات کے لئے نکلا، اس وقت وہ ہاتھی پر سوار تھا، مخدوم الملک کی خانقاہ کے قریب ایک درخت تھا جس کی شاخیں ہاتھی کے گذرنے میں حائل تھیں، شاخ کٹنے تک نواب وہیں پڑا رہا، اسے امید تھی کہ خود مخدوم الملک یا ان کا کوئی آدمی استقبال کے لئے آئے گا اور وہ اس کی معیت میں خانقاہ میں حاضری دے گا، مگر ایسا نہیں ہوا، اور نواب نے غیظ و غضب میں واپس آکر اپنے مصاحبوں سے کہا کہ اس شہر کے علماء اور مشائخ مال داری کے نشہ میں خود کو بلکہ خدا کو فراموش کرچکے ہیں، پھر خیمہ میں جاکر حکم دیا کہ یہاں جتنے قدیم و جدید خانوادے ہیں، ان سب کی جاگیریں ضبط کرلی جائیں، چنانچہ اس کے بعد مشایخ اور مدرسین کی جاگیریں، مراعات اور طلبہ و فقراء کے سب وظیفے اور روزینے یک قلم موقوف کردیئے گئے اور معاشی تنگی نے شہر کے باشندوں کو تحصیل علم

سے روک دیا، جو دور دراز سے آئے ہوئے طالب علم در بدر دست نگر ہوکر پھرنے لگے، مشایخ اور مدرسین طلب معاش میں خانقاہوں اور مدرسوں سے باہر نکل گئے، مدرسے ویران ہوگئے، اور خانقاہیں بوم و شغال کا خرابہ بن گئیں،

اس تباہی و بربادی کے بعد مخدوم الملک شیخ غلام غوث بادشاہ کی خدمت میں دہلی گئے، اور اسے تمام حالات سے آگاہ کیا، بادشاہ نے مستحقین کی جاگیروں کی واگذاری کے لئے شاہی فرمان جاری کیا، مگر نواب برہان الملک نے جونپور کے علماء و مشایخ کے کبر و غرور کی داستان بادشاہ کو لکھ بھیجی اور لکھا کہ اس صورت میں سرکار جونپور کی مال گذاری میں سوا لاکھ کا نقصان ہوجائیگا، اور بادشاہ نواب کی ناراضگی کے خیال سے اس کام سے باز آگیا، البتہ صرف مخدوم الملک کی جاگیر واگذار کرنی چاہی، مگر انھوں نے تنہا خوری پسند نہیں کی اور ان کی غیرت و حمیت نے گوارا نہیں کیا کہ وہ اپنے شہر کے علماء و مشائخ اور دیگر لوگوں کو نظر انداز کرکے صرف اپنا معاملہ درست کرلیں، کچھ دنوں کے بعد دہلی ہی میں اُن کا انتقال ہوگیا،

نواب برہان الملک سعادت علی خاں کے مرنے پر ابو المنصور خاں حاکم ہوا، اس نے بھی ضلع جون پور کے غریبوں کے ساتھ وہی شیوۂ بیداد جاری رکھا بلکہ بقول شخصے "ہر کہ آمد براں مزید نمود" والی بات ہوئی، اور اُس کے نائب تمکین خان خواجہ سرا نے اکثر منصب داروں کی جاگیریں ضبط کرلیں، نواب شجاع الدولہ کے دور حکومت میں ضبطی کی یہ بلا بہت زیادہ پھیل گئی، اور پورے ممالک محروسہ میں ہر خاص و عام یکساں طور سے اس کی زد میں آگیا، جب نواب شجاع الدولہ کو انگریزوں کے مقابلہ میں شکست و

فرار کا منھ دیکھنا پڑا اور مسٹر مارتھ نوائی اودھ کی چاروں سرکاروں کے انتظام پر مامور ہوا تو اس نے تمام لوگوں کی جاگیریں اور وظیفے واپس کردیئے مگر اسی سال لارڈ کلیف نے صلح و مصالحت کے بعد ان سرکاروں کو پھر نواب شجاع الدولہ کے حوالہ کردیا، اور اس کے کارپردازوں نے پھر وہی بیداد شروع کردی، منصب دار بیچارے اپنی جاگیروں اور جائدادوں پر ابھی پوری طرح قبضہ بھی نہیں کرسکے تھے کہ پھر چھین لی گئیں، ۱۱۸۸ھ میں نواب شجاع الدولہ کے انتقال پر نواب آصف الدولہ حاکم ہوا تو اس نے مختار الملک کی وساطت سے ممالک محروسہ کے تمام اضلاع کے حکام کو غرباء کی جاگیروں کی واگذاری کا فرمان جاری کیا، مگر ایلچ خاں اس کار خیر سے مانع ہوا، اور طرح طرح کے حیلے بہانے سے آصف الدولہ کو باز رکھا اسی زمانہ میں مسٹر جان برسٹو کلکتہ سے لکھنؤ آیا، اور نواب کے کارپردازوں کا تماشا دیکھ کر چاروں سرکاروں کو ان کے عمل و دخل سے نکال لیا،

بنارس میں بھی اسی قسم کی صورت پیدا ہوئی وہاں کے حکام نے راجہ اجیت سنگھ کو خوش کرنے کے لئے مظلوموں پر توجہ نہیں دی، جس سے یہ جماعت مصیبت میں مبتلا رہی، آخر ۱۱۹۶ھ میں گورنر ہیسٹنگز نے کلکتہ سے بنارس آکر راجہ اجیت سنگھ کو اس کی بدکرداری کے سبب ضلع بدر کیا، اور علی ابراہیم خاں کو حاکم عدالت مقرر کرکے کچھ لوگوں کی جاگیریں واپس کرادیں،[1]

شیعیت کی تبلیغ واشاعت | نوابانِ اودھ صرف شیعہ ہی نہیں تھے، بلکہ اس مذہب

[1] تذکرۃ العلماء از صفحہ ۵ تا صفحہ ۸،

کے سرگرم داعی و مبلغ بھی تھے، جاگیروں کی ضبطی اور وظیفوں کی بندش میں ان کی اس تنگ نظری کو دخل ہے، جو خانوادے شیعہ ہوجاتے اُن کی جاگیریں بحال ہی تھیں، عزاداری کے لئے بڑی بڑی جاگیریں اور معافیاں دی جاتی تھیں،

مولانا عبدالحئی صاحب نے گل رعنا میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے لہو و لعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں دل سے کوشش کی، ان کے نائب حسن رضا خاں بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے، ان کی کوشش سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہوگئے، اور ان کو جاگیریں ملیں، اور جو اپنی ضد پر قائم رہے، ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کرلی گئیں، شاہ علی اکبر چشتی مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کرکے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیرآبادی کی اقتدا میں ۱۳، رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی، یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علحدہ کرلیا، اور نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمام مذہب دی،[1]

مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے بھی بڑے محتاط انداز میں مآثر الکرام کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ایک بات تاریخی حیثیت سے اس تذکرہ میں خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے، وہ یہ کہ ان علماء و فضلائے بلگرام میں جن کا اس میں ذکر ہے ایک بھی اہلِ تشیع میں سے نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شیعہ نے

[1] گل رعنا ص ۱۵۳،

وہاں بعد کے زمانہ میں رواج پایا، اگر ان علماء میں سے بعض کی اولاد اب بھی وہاں باقی ہے اور وہ مذہب شیعہ پر ہے، یا ان کے نسب ناموں میں ان علما کے نام نکلیں تو ہمارا خیال اور بھی قوی ہو جائے گا، یہ امر واقعی ہے کہ اودھ کی سلطنت نے خاص کر آس پاس کے اضلاع وقصبات پر اور بعض اوقات دور دراز کے مقامات پر بھی مذہبی طور سے خاص اثر ڈالا ہے، چنانچہ جونپور و دیگر مضافات لکھنؤ وغیرہ کے حالات پر نظر ڈالنے سے یہ امر پایۂ تیقن کو پہنچ جاتا ہے، جب مذہب کی پشت پر حکومت ہوتی ہے، تو حالت اندیشہ ناک ہو جاتی ہے، میرا اس سے ہرگز یہ مطلب نہیں، کہ سلطنت اودھ نے مذہب کے معاملہ میں کبھی جبر و تعدی سے کام لیا بلکہ بات یہ ہے کہ جاہ طلبی اکثر لوگوں کی نیت کو جو اعتقاد کے کچے ہوتے ہیں ڈانواں ڈول کر دیتی ہے، ایسا ہر جگہ ہوا ہے، اور یہی اودھ کے اکثر مقامات میں ہوا، اور قصبۂ بلگرام بھی اس اثر سے نہ بچا، معلوم ہوتا ہے کہ آزاد کے زمانہ میں اہلِ تشیع وہاں نہ تھے، اور اگر تھے تو خال خال، لیکن بعد کے زمانہ میں حکومت کے اثر سے اس کا قدم وہاں پہونچا،[1]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بڑے بڑے نامی گرامی سُنی خانوادے جو کئی صدیوں سے علماء، فضلاء، اور مشایخ کے مرکز تھے، نوابی اودھ کے دور میں شیعہ ہو گئے اور جاگیر و جائداد کی ضبطی کے خوف یا لالچ کی وجہ سے ان کے اخلاف نے اپنے اسلاف کا مذہب ترک کر کے شیعیت اختیار کر لی، چنانچہ میر علی عاشقان سرائمیری کے خاندان والے اسی دور میں شیعہ ہوئے، نواب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی کے بعد

[1] مقدمہ مآثر الکرام ص ۱۴،

صوبۂ اودھ کی تمام معافیوں کی ضبطی کا حکم صادر کیا تو سید امیر ماہ بہرائچی کی اولاد میں دو[2] بھائی غلام محمد اور غلام رسول معافی کی بحالی کے لالچ میں آبائی مذہب کے بجائے شیعہ ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نصف معافی بحال اور نصف ضبط ہو گئی اس وقت سے بجائے اعراس کے تعزیہ داری کرنے لگے، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں نصف معافی بھی ضبط ہو گئی، راجہ سید حامد شاہ مانکپوری کا خاندان سلاطین شرقیہ کے زمانہ سے جاگیردار تھا، گونڈہ میں چار پرگنے اور سلون میں دو پرگنے اُن کی جاگیریں تھے، فرخ سیر کے زمانہ سے خوب ترقی کرتے رہے، مگر نوابی اودھ کے آتے ہی اُن پر زوال آیا، اس خاندان میں راجہ سید احمد ثانی بخوف ضبطی معافی تبدیل مذہب کر کے امامیہ ہو گئے، نیز ان کے تین لڑکوں میں سے دو شیعہ ہو گئے،[3] حافظ امان اللہ بنارسی نواب برہان الملک سعادت خاں کا نشانہ بنے، اور ان کو جو مراعات اور جاگیریں عالمگیر سے ملی تھیں سب ضبط کر لی گئیں، اس سلسلہ میں ان کو آخری عمر میں محمد شاہ کے پاس دلی جانا پڑا ان کی اولاد بھی بعد میں شیعہ ہو گئی، شاہ ابو الغوث گرم دیوان بھیروی لہرادی نواب صفدر جنگ کے دور میں سنہ ۱۱۶۴ھ میں چکلہ اعظم گڈھ کے حاکم کے ظلم و زیادتی سے تنگ آکر نواب مفضل علی خاں حاکم غازی پور کے پاس چلے گئے تھے، اسی طرح بہت سے سنی خاندان نوابی اودھ کے دور میں شیعہ بنے یا بنائے گئے، اور جو اپنے مسلک پر اڑے رہے، طرح طرح سے پریشان ہوئے اور دوسرے دیار میں جا کر نوابوں، رئیسوں، راجوں زمینداروں کے علاوہ انگریزوں کے قائم کردہ مدرسوں اور سرکاری

[2] آئینہ اودھ؛

عدالتوں میں ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے، یا پھر اپنے وطن میں غربت وافلاس کی زندگی پر قناعت کرکے اپنی سخت جانی سے علمی اور دینی مشاغل میں منہمک رہے، بلکہ حتی الامکان حالات کا مقابلہ کرتے رہے، مگر شیعیت کی تبلیغ واشاعت کا کام بہت منظم تھا، ہمدردی اور دلداری کے علاوہ مبلغین بھیجے گئے، مدرسے امام باڑے اور چوک تعمیر ہوئے، تعزیہ داری کے لئے معافیاں دی گئیں،

قصبہ مبارکپور میں اس سلسلہ کی کوششوں کے اجمالی بیان سے اس کا اندازہ ہو جائے گا مولوی رمضان علی نے یہاں آکر ایک شاندار امام باڑہ نواب شجاع الدولہ کے دور ۱۲۰۹ھ میں تعمیر کیا، اور اس کے اندر چبوترہ اور پنجہ نواب سعادت علی خاں ہی کے دور میں ۱۲۱۶ھ میں بنوایا، اس زمانہ میں ایسی شاندار عمارت اس دیار میں نہیں تھی طغرے اشعار اور نقش ونگار سے مزین تھی، اسی میں ایک بڑا مدرسہ بھی جاری تھا، اسے مکان رمضان شاہ کہتے ہیں، اسی زمانہ میں شیخ سیف علی باہر سے یہاں آئے اور انھوں نے بھی تبلیغ واشاعت کے ساتھ امام باڑہ رمضان علی کے بالمقابل بجانب جنوب ایک امام باڑہ تعمیر کیا جو بعد میں منہدم ہو گیا، شیخ چراغ علی بھی اسی دور میں شیعیت کی تبلیغ کے سلسلے میں اس قصبہ میں آئے، جنھوں نے قصبہ کے مغرب میں ایک پرفضا باغ میں شاہ پنجہ کے نام سے ایک عظیم الشان امام باڑہ تعمیر کیا، بازار میں قدم رسول نامی عمارت بھی اسی دور کی ہے، ان کے علاوہ اور کئی اور امام باڑے اس دور کے بنے ہوئے اب تک موجود ہیں،

نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں یہاں سب سے پہلا شیعہ سنی فساد ہوا، جس میں ایک شخص جان سے مارا گیا، اس وقت چکلہ اعظم گڈھ کا حاکم

کاظم علی خاں پسر زین الدین خاں کوڑے والا تھا، اس نے مقدمہ میں شیعیوں کی طرفداری کی، اس کے بعد نواب سعادت علی خاں کے پاس فیض آباد میں مرافعہ ہوا مگر یہاں بھی انصاف کے بجائے طرفداری نے کام کیا، اور یہ معاملہ کسی طرح درہم برہم ہوا، اس کی تفصیل مولوی حسن علی فاروقی نے واقعات وحادثات مبارکپور میں درج کی ہے،

عام مسلمانوں میں بے چینی

مغل سلطنت کا آخری دور سخت اضطراب اور بے چینی میں گذرا، جس میں مسلمانوں کو مختلف مصائب وآلام سے دوچار ہونا پڑا، مرکز دہلی کی کمزوری، اندرونی وبیرونی یلغار، انگریزوں کا بڑھتا ہوا اقتدار ملک میں خودمختاریو کا زور، یہ سب ایسے حالات تھے جن میں مسلمانوں کی ملکی، سیاسی، علمی، اور دینی قدریں بری طرح مجروح ہو رہی تھیں، خاص طور سے اہلِ علم اور اربابِ دین ودیانت شدید ترین مشکلات میں مبتلا تھے، اور پورے ملک میں سخت بے چینی پائی جارہی تھی، مرکز اور صوبے اپنی بے دست وپائی کی وجہ سے کچھ کرنا بھی چاہتے تو نہیں کرسکتے تھے، ان ہی حالات میں حضرت سید احمد بریلوی (ولادت ۱۲۰۱ھ شہادت ۱۲۴۶ھ) کی امارت وامامت میں مشہور دینی تحریک اٹھی جس کی مجاہدانہ سرگرمیوں میں بنگال سے لے کر سرحد تک کے علماء اور اربابِ دین جان ومال سے شریک تھے، اس زمانہ میں نواب غازی الدین حیدر، اور نواب نصیر الدین حیدر کی حکومت تھی، ایک مرتبہ جب کہ سید صاحب ٹیلہ پیر محمد شاہ لکھنؤ میں اپنے آدمیوں کے ساتھ فروکش تھے، وزیر معتمد الدولہ نے ان سے ملاقات کرکے پانچ ہزار کی رقم نذر کی، خود نواب غازی الدین حیدر اس موقع پر سید صاحب سے ملنا چاہتے تھے، مگر بعض مجتہدو

نے حیلہ بہانہ کرکے ایسا نہیں کرنے دیا،

نواب سعادت علی خاں کے دور میں چوک اور امام باڑہ کے جھگڑے میں
۱۹/اپریل ۱۸۱۳ء (۱۲۲۹ھ) کو مبارک پور (اعظم گڈھ) پر باہر کے کئی ہزار بلوائیوں
اور فسادیوں نے حملہ کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید ترین جنگ ہوئی،
جس میں ۲۵-۲۶ مسلمان شہید ہوئے، اور تقریباً تین سو بیاگی مارے گئے اور
آخر میں نو رات نو دن تک مبارکپور کے مسلمان لوٹے، جلائے گئے، مگر ان مظلوموں
کی دادرسی نہ ہوسکی، اس جنگ کی تفصیل "واقعات وحادثاتِ مبارک پور"
میں موجود ہے،

اس کے بعد نواب واجد علی شاہ کے آخری دور میں اجودھیا کی بابری مسجد
اور ہنومان گڑھی کا جھگڑا اُٹھا، مسجد پر مہنتوں اور بیراگیوں نے قبضہ کر لیا تھا
اس کے خلاف علماء کی قیادت میں صدائے احتجاج بلند ہوئی اور نواب واجد علی
شاہ اور ان کے حکام مسجد کی واگذاری کا وعدہ کرتے رہے، مگر مان سنگھ کمانڈر
بادلو[1] اور بیراگیوں کے دباؤ کی وجہ سے آخر تک کچھ نہ کرسکے، مجبوراً شاہ غلام حسین
اور مولوی محمد صالح نے عزم جہاد کرکے علم محمدی قائم کیا اور ایک معرکہ میں مولوی
محمد صالح سمیت ۶۹ مسلمان شہید ہوئے، اس حادثۂ فاجعہ کے بعد مولانا امیر علی امیٹھوی
کی امارت وقیادت میں مسجد کی واگذاری کے لئے جہاد کی تیاری ہوئی، آخرکار
۲۶/صفر ۱۲۷۲ھ میں ۱۴۴ مسلمان اپنے امیر مولانا امیر علی صاحب کے ساتھ مقام
شجاع گنج میں شہید ہوئے، اور انگریزی فوج نے ان سب کو بھون کر رکھ دیا،
اس حادثۂ فاجعہ کے دوسرے ہی سال ۱۲۷۳ھ میں انگریزوں نے واجد علی شاہ

---

[1] موجودہ بھلسر،

کو گرفتار کرکے مٹیا برج کلکتہ بھیج دیا اور ۷/فروری ۱۸۵۶ء (۱۲۷۳ھ) میں کرنل اوٹرم
نے پورے اودھ پر قبضہ کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیدیا،

علمی قدردانی اور علماء نوازی

ان نامساعد حالات کے باوجود نوابانِ اودھ کے دور میں دیار
پورب علم وعلماء کی رونق سے محروم نہیں رہا، مذہب شیعہ کے علماء اور ادارے پورے
نشاط وانبساط کے ساتھ علمی اور مذہبی مشاغل میں مصروف رہے، اور نوابانِ اودھ
کی طرف سے ان کی پوری مدد ہوتی رہی، اس دور میں اس مذہب کے بڑے بڑے علماء
وفضلاء اور مجتہدین پیدا ہوئے، جن کی علمی شہرت ایران وعراق اور قم وکاشان
تک پہونچی، نیز دیگر ممالک کے شیعی علماء وفضلاء نے حکومت اودھ میں رہ کر نہایت
قدر ومنزلت پائی، بہت سے سنی علماء بھی تنگ حالی کے باوجود اپنے کام میں صبر وقناعت
کے ساتھ مصروف رہے، اور جرأت سے کام لے کر مدارس قائم کئے، اور عام
مسلمانوں کے تعاون سے علمی ودینی فضا بحال رکھی، اس دور میں ایک خاص
بات یہ ہوئی کہ قدیم خانوادوں کی جاگیروں اور معافیوں کی ضبطی کے نتیجہ میں
قدرتی طور سے علم وفن انکے حلقۂ اثر اور دائرۂ اقتدار سے نکل کر پس ماندہ اور پیشہ ور طبقوں
میں داخل ہوگیا، ان لوگوں نے اپنے زیر اہتمام مدرسے جاری کئے، اپنے طور پر
پڑھنے پڑھانے کا انتظام کیا اور اپنے تعاون سے عمومی مدرسوں میں تعلیم وتعلم
کا سلسلہ قائم کیا، ورنہ اس سے پہلے عام طور پر شرفاء ونجباء کے مکانوں پر یہ کام
ہوتا تھا، اور کمزور اور پس ماندہ طبقوں کیلئے تحصیل علم کے مواقع بہت محدود تھے،
ہمارے دیار میں عوامی مدرسوں کی موجودہ رونق اسی صورتِ حال کا نتیجہ ہے،
"مصائب قومٍ عند قومٍ فوائدُ"

اس دور میں دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ شیعہ سنی مسائل و مباحث پر جانبین سے کثرت سے کتابیں لکھی گئیں اور دونوں کے اختلافات نکھر کر سامنے آگئے، بڑے بڑے مناظرے اور مباحثے ہوئے اور عام مسلمانوں کو ان کی وجہ سے معلومات حاصل ہوئے، مولانا غلام علی آزاد نے اس دور کے بارے میں بجا طور سے لکھا ہے:-

باوجود ایں خرابی ہا رواج علم خصوص معقولات بہ کیفیتے کہ آنجا است در قلمرو ہندوستان ہیچ جا نیست، ہنوز علمائے فحول جلوہ طراز اند و بہ اصول اقصیٰ مراتب کمال ممتاز،

باوجود اس خرابی بسیار کے اس علاقہ میں علم خصوصاً معقولات کا رواج اس طرح ہے کہ پورے ہندوستان میں کسی اور جگہ نہیں ہے، ابھی تک علمائے فحول مسندِ علم پر جلوہ طراز رہ کر مراتبِ کمال کی انتہائی

"با صد جہاں کدورت باز ایں خرابہ جائے است"[1]

شیعہ مذہب قبول کرنے والوں کے لئے نئے نئے مدرسے جاری کئے گئے، اور جگہ جگہ معلمین و مدرسین بھیجے گئے، چنانچہ مبارک پور میں مولوی رمضان علی کے مدرسے کا ذکر آچکا ہے، یہ بہت بڑا مدرسہ تھا، جہاں کئی عالم و فاضل درس دیتے تھے، مولوی علی حسن فاروقی نے "واقعات و حادثاتِ مبارک پور" میں ۱۸۱۳ء کی جنگ کے بیان میں لکھا ہے کہ اس امام باڑہ کے تین طرف بہت خوش قطع سائبان تھے، اور اس میں ایک بڑے متبحر عالم فاضل بے مثل بنام مولوی نثار علی مرحوم ساکن قصبہ سرائمیر برادر چچازاد شیخ جان علی صاحب مرحوم خوشنویس علوم عربی و فارسی کا درس دیتے تھے اور

[1] مآثر الکرام ج ۱ ص ۲۲۳،

اسی امام باڑے میں قیام پذیر تھے، مولوی نثار علی بعد میں اسمٰعیلی مذہب قبول کرکے اس فرقہ کے داعی و مبلغ بن گئے تھے، ۱۸۱۳ء کی جنگ میں یہ اور مولوی محمد نشان اور میر معظم حسین بھی مقتول ہوئے، قصبہ میں شیعہ مذہب کا ایک اور مدرسہ لالن چھتر کے امام باڑے میں تھا، جس میں مولوی بشارت علی ساکن فیض آباد درس دیتے تھے[1] ان مدارس کے علاوہ بہت سے نئے مدارس وجود میں آگئے، جن میں ہر فرقہ کے طلبہ پڑھتے تھے، اس زمانہ میں سنی طلبہ شیعہ علماء اور شیعہ طلبہ سنی علماء سے ادب اور معقولات کی کتابیں پڑھا کرتے تھے،

خود دارالسلطنت لکھنؤ میں فرنگی محل کا مدرسہ قدیم زمانہ سے اہلِ سنت کی مرکزی درس گاہ تھا، جس کا فیض پورے ہندوستان میں جاری تھا، سنیوں کی طرح شیعہ طلبہ بھی اس سے فیضیاب ہوتے تھے، مگر افسوس کہ نوابی اودھ میں اس کی علمی و دینی مرکزیت کو زوال و انتشار نے چاروں طرف سے گھیر لیا، اور اس کی عظمت خاک میں مل گئی، ملک العلماء بحر العلوم مولانا عبد العلی فرنگی محلی متوفی ۱۲۲۵ھ کو تعزیہ داری کے جھگڑے میں جان کے خوف سے خرابی بسیار کے بعد وطن کو خیر باد کہنا پڑا اور وہ شاہجہاں پور، رام پور، اور بہار (بردوان) کی خاک چھانتے ہوئے ارکاٹ اور مدراس میں نواب والاجاہ محمد علی خاں کے یہاں پہونچے اور عزت و احترام کے ساتھ وہیں پوری زندگی درس و افادہ میں بسر کی، اسی طرح اس خانوادہ کے دوسرے عالم ملا محمد حسن فرنگی محلی متوفی ۱۱۹۹ھ کو شجاع الدولہ ہی کے دور میں وطن چھوڑ کر رام پور میں سکونت پذیر ہونا پڑا، ان کی درس گاہ کے دو طالبعلموں کو شیعہ سنی کے نام پر لڑا کر قتل و غارت کا بازار گرم کیا گیا، اور ملا محمد حسن کو جان کے خوف سے لکھنؤ چھوڑنا پڑا،

[1] واقعات و حادثات مبارک پور قلمی ص ۱۷ و ۲۳،

ان واقعات وحقائق کے باوجود نوابان اودھ نے علم وعلماء کی قدر ومنزلت اور سرپرستی بھی کی، اور شیعہ علماء کی طرح بہت سے سنی علماء کو بھی نوازا، ان کے عیب کے ساتھ ان کے ہنر کا تذکرہ بھی ضروری ہے، ع عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو، اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں، مولانا حمد اللہ شیخ سندیلوی متوفی ۱۱۶۰ھ کو نواب ابو المنصور صفدر جنگ کی قدر دانی اور سفارش سے احمد شاہ بادشاہ نے فضل اللہ خاں کا خطاب دیکر کئی گاؤں کی جاگیر دی، اور انھوں نے سندیلہ میں بہت بڑا مدرسہ قائم کیا، اسی طرح ان کے صاحبزادے مولوی عسکر علی سندیلوی کو نواب مذکور نے احمد شاہ کے مقربین میں داخل کیا، اور بادشاہ نے ان کو خیر اللہ خان کا خطاب دیکر کئی گاؤں جاگیر میں عطا کئے، انھوں نے بھی سندیلہ میں مدرسہ منصوریہ کے نام سے مدرسہ قائم کیا،

مشہور شیعی عالم اور مجتہد سید دلدار حسین نصیر آبادی متوفی ۱۲۳۵ھ نے نواب آصف الدولہ اور وزیر حسن رضا خاں کے یہاں بے پناہ مقبولیت اور وجاہت پائی، وزیر نے ان کو اپنے لڑکوں کا معلم بنا کر گراں قدر مشاہرہ سے نوازا، اور جب وزیر مذکور نے شیخ علی اکبر صوفی فیض آبادی کے مشورہ سے نواب آصف الدولہ کو جمعہ وجماعت کے قیام پر راضی کیا تو سید دلدار حسین کو امامت کے لئے منتخب کیا، ان کے صاحبزادے مولوی باقر کو نواب امجد علی شاہ نے منصف الدولہ کا خطاب دے کر عدالت کا افسر اعلیٰ بنایا، اور وہ آخر تک اسی عہدہ پر قائم رہے، مہاراجہ رتن سنگھ متوفی ۱۲۷۶ھ کا باپ بالک رام نواب آصف الدولہ کے دور میں لکھنؤ میں افسر توپخانہ تھا، رتن سنگھ نے اپنے آبائی مذہب پر رہتے ہوئے عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت زبانوں کے ساتھ ریاضی، ہیئت، انشاء اور شاعری میں مہارت حاصل کی، نواب

غازی الدین حیدر نے ان کو منشی الملک کا خطاب دے کر اپنے دیوان کا میر منشی بنایا، وہ نواب محمد علی شاہ کے دور تک اسی عہدہ پر رہے، اور نواب مذکور نے ان کو فخر الدولہ دبیر الملک، مہاراجہ رتن سنگھ بہادر، ہوشیار جنگ کے خطابات سے نوازا، اس کے بعد رتن سنگھ ۱۲۶۲ھ میں مسلمان ہوگئے، اور تین سال کے بعد انتقال کیا،

مولانا علی اکبر شاہ فیض آبادی متوفی ۱۲۲۱ھ، شیخ قطب الدین مودودی چشتی کی نسل سے اپنے زمانہ کے مشہور چشتی صوفی تھے، اور تفضیلی مذہب رکھتے تھے، یعنی سنی ہونے کے باوجود حضرت علیؓ کو حضرات شیخینؓ سے افضل مانتے تھے، وہ اودھ کے حکمرانوں اور امیروں کے یہاں بے پناہ مقبولیت رکھتے تھے، نواب آصف الدولہ اور وزیر حسن رضا خاں ان کے خاص معتقدوں میں سے تھے، دونوں ان کی خدمت میں حاضری دیتے تھے اور ان کے مشوروں پر عمل کرتے تھے، حکیم گونگے مرزا محمد علی لکھنوی متوفی ۱۲۶۲ھ اس دور کے مشہور طبیب وحکیم تھے، اصول کے ایسے پابند تھے کہ علاج ومعالجہ میں کسی چھوٹے بڑے کی پروا نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ نواب نصیر الدین حیدر سخت بیمار پڑا اور حکیم صاحب کا علاج شروع کیا، مگر پرہیز میں لاپرواہی کرتا تھا، حکیم صاحب کو اس کی خبر ملی تو علاج بند کر دیا، نواب نے دوسرے اطباء کی طرف رجوع کیا مگر کچھ فائدہ نہ ہوا، آخر کار نواب نے حکیم صاحب کے پاس آدمی بھیج کر معذرت کی، حکیم صاحب نے علاج کرنے سے انکار کر دیا، نواب نے ایک شاہی افسر کو بھیجا، مگر کام نہیں چلا، حتیٰ کہ وزیر حاضر ہوا، مگر حکیم صاحب اپنی ضد پر اڑے رہے، نواب نے مجبور ہو کر کہلا بھیجا کہ اگر اب بھی آپ علاج سے انکار کریں گے تو شدید مرض کے باوجود کسی طرح سے خود مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا، اس کے بعد حکیم صاحب نے یہ کہہ کر دوبارہ علاج

شروع کیا کہ بادشاہ کی حکومت عوام کے جسم پر ہوتی ہے اور میری حکومت دل پر ہے، میں اگر جنگل میں چلا جاؤں تو لوگ میرے گرد جمع ہو جائیں گے،

مولانا سید مرتضیٰ حسینی لکھنوی متوفی ۱۲۵۰ھ انگریزی حکومت کے ملازم تھے، اسی سلسلہ میں کچھ دنوں لکھنؤ سے جا کر کلکتہ میں مقیم رہے، وہاں سے واپس ہو کر نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ کے مفتی بنائے گئے، اس سے پہلے نواب غازی الدین حیدر کے دور میں انھوں نے حضرت سید احمد بریلوی کے ہاتھ پر بیعت کی تھی،

مولانا جعفر حنفی بریلوی متوفی ۱۲۳۲ھ نہایت دیندار، عبادت گذار اور بزرگ عالم تھے، نواب سعادت علی خاں نے ان کو رائے بریلی سے لکھنؤ کے عہدۂ قضا کے لئے طلب کیا، مگر مولانا نے صاف انکار کر دیا،

مفتی ابراہیم حنفی بنارسی متوفی ۱۲۵۴ھ نوابانِ اودھ کے دور میں شہر لکھنؤ کے مفتی تھے، ساتھ ساتھ درس و تدریس کا مشغلہ بھی جاری رکھتے تھے،

مولانا احمد بن یعقوب انصاری سہالوی مشہور عالم و فقیہ تھے، نواب سعادت علی خاں کے زمانہ میں لکھنؤ میں عہدۂ قضا پر فائز ہوئے، اور نواب مذکور کی زندگی بھر اسی عہدہ پر رہے،

مولانا جعفر علی کسمنڈوی متوفی ۱۲۹۴ھ نے لکھنؤ میں مفتی ظہور اللہ انصاری فرنگی محلی سے پڑھ کر دہلی میں شاہ عبد العزیز صاحب محدثؒ سے تعلیم حاصل کی، پھر لکھنؤ آکر امراء و حکام سے منسلک رہے، اور ایک مقام کے حاکم بنائے گئے،

مولانا حکیم حیدر حسین بریلوی متوفی ۱۲۵۶ھ مخدوم عادل الملک جونپوری کی نسل سے تھے، وہ نوابانِ اودھ کے مقربین میں سے تھے، اور رائے بریلی کے حاکم

بنائے گئے،

مفتی خلیل الدین کاکوروی متوفی ۱۲۷۸ھ ریاضی کے مشہور عالم تھے، ابتداء میں کان پور کے مفتی بنے، اس کے بعد نواب سعادت علی خاں نے ان کو رصدگاہ بنانے کا کام سپرد کیا، مگر نواب کے انتقال کی وجہ سے یہ کام رُک گیا، نواب غازی الدین حیدر نے اپنے زمانہ میں ان کو کلکتہ کی سفارت پر مقرر کر کے پانچ سو روپیہ مشاہرہ دیا،

مفتی علی کبیر مچھلی شہری متوفی ۱۲۶۹ھ نے فنون عقلیہ و ریاضیہ حاصل کرنے کے بعد دہلی جا کر حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ سے حدیث پڑھی، بعد میں امراء و حکام سے منسلک ہو کر بڑی مقبولیت پائی، اور اپنے خاندان والوں کی سفارش کر کے ان کو بڑے بڑے عہدے دلوائے، اسی طرح اور بہت سے اہلِ علم و فضل کو نوابانِ اودھ کے دور میں قدر و منزلت ملی،

حیاتِ شبلی

نو سو صفحوں کی ضخیم کتاب صرف اس عہد کے ایک جامع کمالات بزرگ کی سوانح عمری نہیں بلکہ مولانا شبلی کے دور تک کے ہندوستانی مسلمانوں کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی، ملی اور قومی تحریکات و واقعات کی تاریخ بن گئی ہے، اسی سلسلہ میں متن و حاشیہ دونوں میں بہت ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی آگئے ہیں جن کا اس عہد کے سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا، شروع میں ایک دیباچہ ہے اسکے بعد ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں دیار مشرق میں مشہور اکابر علماء کے حالات آگئے ہیں، یہ بہت عرصہ سے ختم تھی، اب اس کا نیا اڈیشن بڑے اہتمام سے چھاپا گیا ہے اور پچھلے اڈیشن کی ہو بہو نقل ہے، مؤلفہ مولانا سید سلیمان ندوی

قیمت ۲۴-۰۰،

"منیجر"

اسلامی مسیحی تبادلۂ خیالات

از جناب خلیل حامدی صاحب پاکستان

الحاد بے دینی کو جو عالمگیر فروغ ہو رہا ہے اس نے اہل مذاہب کو اپنی صفوں کے انتشار کو دور کرنے کی جانب متوجہ کر دیا ہے، دنیا کے بڑے بڑے مذاہب باہمی اختلافات کو نظر انداز کر کے الحاد کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ بنانا چاہتے ہیں، مانٹریال کا انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز عرصہ سے بین المذاہب افہام و تفہیم کے لئے کوشاں ہے، امریکہ اور یورپ کی متعدد یونیورسٹیوں میں مذاہب کے مطالعہ کے شعبے قائم کئے گئے ہیں، دو تین سال ہوئے بیروت میں مختلف مذاہب کے نمایندوں کی کانفرنس اسی غرض سے ہوئی تھی، ہندوستان میں بھی اسلام اینڈ ماڈرن ایج سوسائٹی نے اس قسم کے کئی بین الاقوامی اجتماع کئے ہیں جن میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے خوشگوار ماحول میں مختلف مسائل پر بحث کی اور تعاون و یکجہتی کے امکانات کا جائزہ لیا، چند مہینے ہوئے لیبیا میں بھی اس قسم کا ایک سیمینار ہوا جس میں بہت سے ملکوں کے عیسائی اور مسلمان نمایندے شریک ہوئے اور اسلام و مسیحیت کے درمیان سینکڑوں برس کے اختلاف دور کر کے اتحاد و تعاون کا نیا دور شروع کرنے کی دعوت دی، ان مباحث کی اہمیت کی بنا پر ہم [illegible] وقت سے خلیل حامدی صاحب کی مرتب کردہ روداد معارف میں درج کی جا رہی ہے تا کہ ہمارے قارئین دنیا کے حالات اور موجودہ رجحانات کا اندازہ کریں، عیسائی نمایندوں کی استعداد، صلاحیت اور انداز بحث و گفتگو خاص طور پر ہمارے مذہبی حلقہ کے لئے قابل غور ہے، راقم الحروف کو خود کئی بار

بین المذاہب کانفرنسوں میں شریک ہونے کا موقع ملا، اور ہر مرتبہ یہی احساس ہوا کہ ہمارے مذہبی رہنما دوسرے مذاہب کے رہنماؤں کے مقابلہ میں نہ صرف عصر حاضر کے علوم و السنہ سے کم واقف ہیں، بلکہ تحقیق کے جدید معیار اور تعبیر کے نئے انداز سے بھی زیادہ باخبر نہیں ہیں، اسلئے اکثر مواقع پر علماء کے بجائے اسلام کی وکالت یونیورسٹیوں کے پروفیسروں ہی کو کرنی پڑی، یہ صورت حال مذہبی مدارس کے لئے قابل غور ہے، نصاب و نظام تعلیم میں دور رس تبدیلیوں کے بغیر عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برا ہونا ناممکن ہے،

"عبد السلام قدوائی"

اسلامی مسیحی ڈائیلاگ سمینار یکم فروری تا ۶ فروری ۱۹۷۶ء طرابلس (لیبیا) میں منعقد ہوا، اس میں ساٹھ ممالک کے تقریباً تین سو نمایندے شریک ہوئے، مسلمان نمایندوں میں علماء کم اور یونیورسٹیوں کے پروفیسر اور ریسرچ اسکالر زیادہ تھے، عیسائیوں میں کیتھولک پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس بھی تھے، یورپ اور امریکہ کے نمایندوں کے علاوہ افریقہ کے مختلف حصوں سے بھی عیسائی پادری اور اسکالر کافی تعداد میں شریک ہوئے، افریقہ کی عیسائی ریاستوں مثلاً سینیگال، حبشہ، تنزانیہ، اور گینیا وغیرہ کے عیسائی مندوبین نے نمایاں حصہ لیا، اشتراکی ممالک مثلاً روس، یوگوسلاویہ، رومانیہ وغیرہ سے بھی دونوں مذاہب کے نمایندے پہنچ گئے تھے، افریقی نمایندوں کے ناموں سے یہ نہ پتہ چلتا تھا کہ عیسائی ہیں یا مسلمان، راقم نے جب استقبالیہ کمیٹی کے ایک ذمہ دار شخص سے دریافت کیا کہ مجھے عیسائیوں اور مسلمانوں کی الگ الگ تعداد بتائی جائے تو وہ کہنے لگے کہ میرے رجسٹر میں جو نام درج ہیں، ان میں سے متعدد ایسے ہیں کہ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کون عیسائی ہیں اور کون مسلمان ہر مہمان کی شہریت کے ساتھ دین کا اندراج نہیں ہے،

سیمنار میں اسلامی فریق کے لیڈر لیبیا کے وزیر تعلیم محمد احمد الشریف تھے، اور مسیحی فریق کے لیڈر ویٹیکن کے کارڈینل سرگیو پگنوڈلی تھے، کارڈینل صاحب نے خود تو صرف افتتاحی تقریر پر اکتفا کیا، مگر ان کی بھاری بھرکم پارٹی نے جو ویٹیکن سے وہ اپنے ساتھ لائے تھے، بحث و مباحثہ میں خوب حصہ لیا، ان میں مونسینور، پیٹرو روساتو، چیرمین کمیٹی اسلامی مسیحی تعلقات، اور ڈاکٹر فرانسس ابو خ سکریٹری کمیٹی اور ڈاکٹر انتھونی شو لیکال ایڈوائزر کمیٹی جسٹس اینڈ پیس خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عیسائی فرقوں میں تناسب نمایندگی کے لحاظ سے کیتھولک درجہ اول پر تھے اور پروٹسٹنٹ اور آرتھوڈوکس درجہ دوم پر، بحث و مباحثہ میں عیسائیوں کے تینوں گروپ ہم آواز تھے، بلجیم سے بھی ایک بڑا وفد آیا ہوا تھا، جن میں سے چند نام یہ ہیں، فادر ویان، یہ بلجیم کے سب سے بڑے اخبار "لبرل بلجیکا" کے اڈیٹر ہیں، جان ڈیلوس یہ بلجیم کے مجلہ "نیو میگزین" کے اڈیٹر اور بلجیم فلسطین تعاون کمیٹی کے چیرمین ہیں، جیرالڈ فودرے، یہ صاحب بلجیم کی مختلف یونیورسٹیوں میں مذہب اور طبیعات کے استاد ہیں، مچل پولیٹور، یہ بلجیم مین لووان یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کے استاد ہیں، ڈاکٹر بشارت خضرا، یہ بلجیم کے عیسائی وفد کے ہمراہ آئے مگر اصلاً فلسطینی عرب ہیں اور اب موزان یونیورسٹی میں عرب اسٹڈیز کے انچارج ہیں، ان کے علاوہ جو عیسائی لیڈر شامل محفل تھے ان میں رومانیہ کے لارڈ بشپ، لبنان میں رومن کیتھولک کے لارڈ بشپ گریگوری حداد لبنان میں سیریانی آرتھوڈوکس کے نمایندے بشپ اتھنیس ابراہام، اسکندریہ یونیورسٹی (مصر) کے قبطی رہنما ڈاکٹر سیس فہنام حبشہ کے چرچ آف قدیسہ مریم کے پادری شحاتہ قنوانی، مالٹا کے فادر منتوف، طرابلس کے بشپ بریفتیال اور مشہور عیسائی محقق ڈاکٹر آرنلڈ کیمپس، ڈاکٹر موریس مورمانی قابلِ ذکر ہیں، صحافیوں اور اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کے نمایندوں میں بھی عیسائیوں (بلکہ یہودیوں کی اچھی خاصی تعداد تھی،

مسلمان فریق کے لیڈر، لیبیا کے وزیر تعلیم محمد احمد الشریف تھے اور ڈپٹی لیڈر لیبیا کی عرب سوشلسٹ پارٹی کے شعبہ امور خارجہ کے سربراہ احمد شحاتی تھے، عالمی پیمانے پر جن مسلمان اہلِ علم و فکر نے سیمنار میں حصہ لیا، ان میں سے نمایاں اصحاب یہ ہیں، شیخ محمود صبحی، سکریٹری جنرل جمعیت دعوت اسلامیہ لیبیا، شیخ صبحی صالح، نائب صدر مجلس اعلیٰ برائے امور اسلامیہ لبنان، ابراہیم النعویل، یہ لیبیا کے ایک نامور وکیل ہیں، جنرل محمود شیث خطاب، یہ عرب دنیا کے مشہور اسلامی مورخ ہیں، عراق کے رہنے والے ہیں، متعدد حکومتوں میں وزیر رہ چکے ہیں، آج کل مصر میں اس کمیٹی کے سربراہ ہیں جو قرآن حکیم کی ایک جامع لغت تیار کر رہی ہے، پروفیسر خورشید احمد رکن مسلم کونسل آف یورپ ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی، فلاڈلفیا امریکہ، یہ اصلاً فلسطین کے رہنے والے ہیں، پاکستان میں بھی حکومت پاکستان کی ریسرچ اکیڈمی میں کچھ عرصہ رہ چکے ہیں آجکل امریکہ میں ہیں اور ایم ایس۔ اے (مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن) سے وابستہ ہیں، مصر کے ڈاکٹر محمد احمد خلف اللہ، شیخ احمد عبد العزیز ابوظبی کی عدالت شرعیہ کے قاضی القضاۃ، ڈاکٹر عزالدین ابراہیم حاکم ابوظبی کے ثقافتی مشیر، عبدالرحمٰن عطیہ، استاد ٹریننگ کالج طرابلس یونیورسٹی لیبیا، حمد الفقیس، پرنسپل، دراسات اسلامیہ کالج، بغداد یونیورسٹی، عبد الرزاق شبیب سکریٹری جنرل، عرب بار ایسوسی ایشن، عراق، امریکہ میں مسلمان طلبہ کی مشہور تنظیم ایم ایس اے کی طرف سے ڈاکٹر جمال برزنجی اور اقبال یونس بھی شریک ہوئے، اسلامی پارٹی کے یوسف مظفر الدین بھی تشریف لائے، نیز عبداللہ صالح نیشنل یونین آف کینیا مسلمز، علامہ محمد اسد مصنف دی روڈ ٹو مکہ اور اسلام ایٹ دی کراس روڈز (مراکش) ڈاکٹر مصطفیٰ محمود، مصر، شیخ عمران جمعہ (زائرے) الحاج نعیم شیخ العلمار (یوگوسلادیہ) مولانا وحید الدین خاں (انڈیا) شیخ علی احمد حسن ڈپٹی اٹارنی جنرل صومالیہ وغیرہ شریک ہوئے،

سیمنار میں بحث کے لئے ذیل کے چار موضوع منتخب کر لئے گئے تھے :-

(۱) کیا مذہب، انسانی زندگی کی آئیڈیالوجی بن سکتا ہے؟

(۲) مختلف مذاہب کے اندر کون سی بنیادیں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں؟ نیز انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کے اندر کہاں کہاں انسان باہم متحد ہو سکتے ہیں؟

(۳) عدل اجتماعی خدا پر ایمان کے نتیجہ میں بروے کار آ سکتا ہے؟

(۴) ان سابقہ غلط تصورات و خیالات کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے، جو دونوں مذاہب (اسلام اور مسیحیت) کے مابین قائم ہو چکے ہیں، نیز اس عدم اعتماد کی فضا جس نے دونوں میں تفریق برپا کر رکھی ہے، کیسے ختم کی جا سکتی ہے؟

ان چاروں موضوعات پر پہلے دونوں فریقوں کی طرف سے ایک ایک مقالہ پیش کیا جاتا تھا، پھر اس پر دونوں طرف کے اہل علم بحث و مباحثہ کرتے تھے، پہلے موضوع پر مسلمانوں کی طرف سے طرابلس یونیورسٹی لیبیا کے پروفیسر عبد الرحمٰن عطیہ اور عیسائیوں کی طرف سے ویٹی کن کے نمائندے ڈاکٹر انطونی شو یکال نے مقالے پیش کئے، دوسرے موضوع پر مسلم فریق کی طرف سے امریکہ کے ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی اور مسیحی فریق کی جانب سے پادری مورس بورمانس آف رومانیہ نے مقالے پڑھے، تیسرا موضوع بڑا ہنگامہ خیز رہا، اس پر مسلم فریق کی طرف سے لیبیا کے قانون داں ابراہیم الخویل اور عیسائی فریق کی طرف سے ڈاکٹر پادری کانٹ نے اپنا اپنا مقالہ پڑھا، چوتھا موضوع مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین پیدا شدہ غلط فہمیوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں تھا، اس پر مسلمانوں کی طرف سے ڈاکٹر عز الدین ابراہیم (ابو ظبی)، اور عیسائیوں کی طرف سے ویٹی کن کے نمائندے ڈاکٹر فنز جبیر اللہ (جو بلجیم سے آئے تھے) نے مقالات پیش کئے،

یہ دلچسپ مناظرہ طرابلس کے نہایت پُر فضا علاقے میں واقع میدان التحریر ہال میں منعقد ہوا، عربی، انگریزی، فرانسیسی اور اطالوی زبانوں کے فوری ترجمہ کا بھی انتظام تھا، سیمینار کی صدارت عیسائی فریق اور مسلم فریق کے مابین باری باری منتقل ہوتی رہی، ویٹی کن اپنے روایاتی لباس اور راہبانہ طور و طریق کے ساتھ تھا، کارڈینل لارڈ بشپ، بشپ اور فادر اپنے مخصوص یونیفارم میں تھے، مسلمان بنجول پر عمامہ پوش دو ہی چار تھے، باقی سب کوٹ اور پتلون میں ملبوس تھے، یہاں نہ صرف دنیا کے ساٹھ بڑے بڑے ممالک کے اہل علم و نظر تشریف فرما تھے، بلکہ دنیا کے دو بڑے مذاہب کا ہر پہلو سے مقابلہ اور موازنہ تھا، یہاں کی ہر چیز گفتار و کردار، ظاہر و باطن اور اپنے اصول و عقیدہ سے وابستگی ایک دوسرے پر گہرا اثر ڈال رہی تھی، اگر مسیحیت آزمائش میں تھی تو اسلام اس بھی بڑھ کر آزمائش میں تھا،

مہمانوں کو طرابلس کے جدید ترین ہوٹل فندق الشاطی میں ٹھہرایا گیا تھا جو چند ماہ ہوئے بحر متوسط کے کنارے تعمیر کیا گیا ہے،

کارڈینل سرگیو پگنوڈلی کی یہاں بڑی تعریف ہوتی رہی، یہ اب موجودہ پاپائے روم کے بعد ویٹی کن کی گدی کے امیدوار ہیں، ۱۹۵۱ء میں انھیں لارڈ بشپ کا منصب ملا، ویٹی کن کی طرف سے مختلف اوقات میں یہ بولیویا، کینڈا اور نائیجیریا میں سفیر رہ چکے ہیں، ۱۹۷۴ء میں انھوں نے سعودی عرب کا دورہ کیا تھا، اور شاہ فیصل شہید سے ملے تھے، اسی سال کے آخر میں جب سعودی عرب کے علماء کا وفد شیخ محمد الحرکان، وزیر عدل کی قیادت میں ویٹی کن میں پوپ سے ملنے کیلئے گیا تو کارڈینل سرگیو نے اس وفد کا استقبال کیا تھا، یہ مسلمانوں کی تمام زبانیں روانی سے

بولتے ہیں، قرآنی آیات کثرت سے تلاوت کرتے ہیں، مسلمان مفکرین کے ساتھ ان کی گفتگوئیں جس خوش اسلوبی اور وسعتِ نظر سے ہوئیں اس پر لوگوں نے بہت داد دی، لیبیا کے سربراہ کرنل قذافی نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، ۵ فروری ۱۹۷۶ء کے اجلاس میں کارڈینل نے ایک ایسا جملہ کہا جس پر حاضرین نے بڑی تالیاں بجائیں، انھوں نے کہا، "مسیحیت کے نام پر ہم ان الفاظ پر اظہار معذرت کرتے ہیں اور طالبِ عفو ہیں جو رسول صلوٰۃ اللہ وسلامہ علیہ کی ذات کے بارے میں کہے جاتے رہے ہیں،"

اس جملہ پر لیبیا کے نمائندے جناب حمیدہ الزبیطی نے کہا "میری نظر میں یہ جملہ تاریخ کے اندر پہلا اور بہت بڑا فیصلہ ہے، اور دونوں مذاہب کے مابین تاریخ کا ایک نیا باب کھول رہا ہے۔" ڈاکٹر عزالدین ابراہیم (ابوظبی) نے مزید آگے بڑھ کر ویٹی کن سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ "خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کریں اور مسلمان اساتذہ کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں اور الٰہیات کی فیکلٹیوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔" اس پر ایک اخبار نویس کے جواب میں کارڈینل نے کہا۔ "نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرنا بلاشک نہایت اہم مسئلہ ہے، لیکن یہ موضوع الٰہیات سے تعلق رکھتا ہے، اور گہرے مطالعہ کا متقاضی ہے، ہمارے سکریٹریٹ کی طرف سے بڑے بڑے ماہرین الٰہیات کو چند ماہ پیشتر یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ اس مسئلے کا مطالعہ کریں، ہمیں امید ہے کہ اس مطالعہ کے نتیجہ میں جلد ہی ہمیں وہ حل دستیاب ہو جائے گا جو ہمارے ضمیر کو بھی مطمئن کرے گا اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو بھی۔" لبنان کے لارڈ بشپ گریگوار حداد نے تو اختتامی اجلاس میں عیسائیوں کو خود ہی یہ دعوت پیش کر دی کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت تسلیم کر لی جائے، اس موقع پر گریگوار نے یہ الفاظ بطور تجویز دہرائے، (ترجمہ) ہم گواہی دیتے ہیں کہ محمد اللہ

کے رسول اور تمام انسانیت کے لئے اللہ کے نبی ہیں)

مسلمان نمائندے دو طرح کے نظر آئے، ایک وہ جو عیسائی مفکرین سے مرعوب تھے، اور ان کی ہر ممکن خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور اسلام اور مسیحیت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے، اور قرآن کی وہ آیت پڑھ پڑھ کر سنا رہے تھے جس میں عیسائی قسیسوں اور راہبوں کی تعریف کی گئی ہے، یہ گروہ اپنے اس موقف کی تاویل یہ کرتا تھا کہ یہودیوں نے عیسائیوں کو اپنا ہمنوا بنا کر انھیں دنیا کے اندر مسلمانوں کے خلاف کر رکھا ہے لہٰذا اب ہم انھیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کریں، یہ آیت بھی اس گروہ کی طرف سے بار بار تلاوت کی جاتی رہی کہ "تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا و بینکم" مگر دوسرا گروہ مسلمانوں کی نمائندگی کر رہا تھا اور نہایت صحت مندانہ بنیادوں پر ڈائیلاگ کا حامی تھا، اس کے اندر اپنے دین پر پورا اعتماد پایا جاتا تھا، اور وہ ہر بات کرتے وقت حسن اسلوب اور لطافت بیان کا دامن ترک کئے بغیر دلیل وحجت سے کام لیتا تھا، اور یہ سمجھتا تھا کہ لن ترضی عنک الیہود ولا النصاریٰ حتیٰ تتبع ملتھم (جب تک تم ان کی ملت کی پیروی نہ کرو یہود و نصاریٰ تم سے ہرگز راضی نہیں ہو سکتے) ایک اور بات عجب یہ نظر آئی کہ مغرب کے سفید فام عیسائی نمائندوں اور افریقہ کے سیاہ فام عیسائیوں کے درمیان میل بہت کم ہے، افریقی عیسائی، مسلمانوں سے قریب تر ہیں، خصوصاً جب تاریخ میں استعمار اور مسیحیت کی ملی بھگت کا ذکر چھڑ جاتا تو افریقی نمائندے مسلمانوں کا ساتھ دیتے تھے

صدر لیبیا، اسلامی موضوعات پر بحث و مباحثہ کرنے میں خوب حصہ لیتے ہیں، عیدین کی نمازوں میں دو دو گھنٹے کی تقریریں ہوتی ہیں اور اسلام، اسلامی فلسفہ اور اسلامی تاریخ پر اپنے مخصوص نقطہ نظر کے مطابق روشنی ڈالتے ہیں، اس سیمینار

میں بھی انھوں نے عملاً حصہ لیا، پہلے ہی دن جب یہ موضوع زیر بحث تھا کہ کیا مذہب زندگی کی آئیڈیالوجی بن سکتا ہے، قذافی صاحب اجلاس میں پہنچ گئے، اور مسلم گروپ کی نشستوں کے درمیان بیٹھ گئے، اور اسلامی مفکر کی حیثیت سے بحث میں پورا حصہ لیا، افتتاحی اجلاس کے بعد ۹ فروری ۱۹۷۶ء کو قذافی صاحب نے تمام وفود سے ملاقات کی اور بڑی بے تکلفی سے باتیں کیں،

شہر کی عام فضا بھی یہ اشارہ کر رہی تھی کہ اسلام اور مسیحیت کا طرابلس میں مقابلہ ہو رہا ہے، سمینار کے اندر مقامی باشندوں کی بہت محدود تعداد شریک تھی، مگر عام شہریوں کے لئے لیبیا کا الاذاعۃ المرئیہ (ٹیلیویژن) اس کی ضروری تفصیلات پیش کرتا رہتا تھا، جب راقم نیروبی سے ادیس ابابا اور قاہرہ ہوتا ہوا طرابلس کے ہوائی اڈے پر اترا تو ہوائی اڈے پر مختلف ملکوں کے پرچم لہراتے دیکھ کر اندازہ ہو گیا کہ مجلسِ مناظرہ گرم ہے، سمینار کے منتظمین نے راقم کا استقبال کیا اور پھر وی، آئی، پی، لاونج میں کچھ دیر آرام کرانے کے بعد طرابلس کے فندق الشاطئ میں روانہ کر دیا، طرابلس کا ہوائی اڈہ اور طرابلس کے در و دیوار ایسے اشتہارات سے بھرے تھے، جن میں اسلام اور مسیحیت کو باہم بغلگیر ہونے کی دعوت دی گئی تھی، مثلاً

"آسمانی کتابیں، انسان کا احترام سکھاتی ہیں اور تمام ابنائے آدم کے مابین مساوات قائم کرتی ہیں"

"اس سمینار کا مقصد انسانیت کی بحالی ہے"

"اللہ کا دین بھی ایک ہے، اور انسان بھی ایک ہی خاندان کے افراد ہیں"

"براہ راست گفت و شنید امر واقع کو سمجھنے کا واحد ذریعہ ہے"

"آسمانی کتابیں انسانیت کا پیغام لے کر آئی ہیں" وغیرہ وغیرہ،

قاہرہ کی طرح طرابلس بھی آج کل اشتہارات کی زد میں ہے، طرابلس کی دیواریں طرح طرح کے اشتہارات سے لت پت ہیں، مثلاً

"انقلاب کے دشمنوں کو کچل دو"

"عوامی کانفرنسوں کے بغیر جمہوریت وجود میں نہیں آسکتی"

"عرب موسیقی پوری تاریخ میں عرب اتحاد کی حفاظت کرتی رہی ہے"

پچھلے دنوں لیبیا میں کچھ عناصر نے بغاوت کا راستہ اختیار کیا تھا، ان کے بارے میں اشتہارات لگے ہوئے ہیں کہ

"کافر کبھی کامیاب نہیں ہوتے"

بُرے کام کرنے والے کیا یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ ہم سے آگے نکل جائیں گے، ان کا یہ خیال بہت بُرا فیصلہ ہے،

قذافی کے "پانچ اصول" بورڈ پر لکھ کر بڑے بڑے چوراہوں میں نصب ہیں،

مصر کے نامور ڈاکٹر مصطفیٰ محمود نے کانفرنس کے اندر ایک پُر لطف ہلچل پیدا کر دی، انھوں نے بائبل کا ایک ایسا اڈیشن عیسائی نمائندوں کی خدمت میں پیش کیا، جو بیت المقدس میں چھپا ہے اور جس کے اندر یہودیوں نے جابجا تحریف کی ہے، مسلم فریق کے نائب صدر احمد صبحانی نے یہ نسخہ نادر، ڈاکٹر فرانس ابومخ (Francois Abumokh) کو پیش کر دیا، فرانس ابومخ، ویٹی کن میں اسلامک ڈپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں اور عربی زبان کے ماہر ہونے کے علاوہ دوسری مختلف اسلامی زبانوں پر بھی عبور رکھتے ہیں کرنل معمر القذافی نے اس بائبل کے بارے میں یہ مزید انکشاف کیا کہ اس میں دو سو ساٹھ مقامات پر یہودیوں نے تحریف کی ہے، اسرائیل سے فادر کابوشی نے حیل سے ایک

خط سیمینار کو بھیجا جو یہاں تقسیم کیا گیا، فادر کابوشی نے جسے یہودیوں نے بغاوت کے الزام میں جیل میں بند کر رکھا ہے، اپنے خط میں بتایا ہے کہ یہودی، عیسائیوں کے مقدس مقامات کی توہین کر رہے ہیں، القیامہ چرچ میں حضرت مریمؑ کے بت کو توڑ پھوڑ دیا گیا ہے ان کا تاج چوری کر لیا گیا ہے، جس جگہ سیدنا مسیحؑ پیدا ہوئے ہیں اسے پامال کیا جا رہا ہے، کینستہ المہد اور بیت اللحم میں "ستارۂ داؤد" نصب کر دیا گیا ہے، مسجد اقصیٰ کی بھی توہین کی جا رہی ہے، تاریخی کھدائیوں کے بہانے مسجد کی دیواروں کو گرایا جا رہا ہے ۱۹۶۷ء سے اب تک عیسائیوں کو وہاں سے جس طرح نکالا جا رہا ہے، اس کے نتیجہ میں ان کی تعداد جنوبی علاقہ میں ڈیڑھ لاکھ سے صرف پینتالیس ہزار رہ گئی ہے"

عیسائی فریق نے فادر کابوشی کا یہ خط سیمینار میں تقسیم کر کے اپنا فرض ادا کر دیا، لیکن کیا اچھا ہوتا کہ مسلمان فریق کی طرف سے بھی شیخ مصطفیٰ ابوطیر کا مسئلہ اٹھایا جاتا، شیخ مصطفیٰ ابوطیر، بیت المقدس کے مجاہد عالم دین ہیں، انھیں پچھلے سال سے یہودیوں نے جیل میں ڈال رکھا ہے، وہاں ان کو طرح طرح کی اذیتیں دی جا رہی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کا اصل نشانہ مسلمان اور مسلمانوں کے مقدس مقامات ہیں، لیکن فادر کابوشی کا بیان یہ بھی بتا رہا ہے کہ یہودی کسی بھی آسمانی مذہب کو دیکھنا پسند نہیں کرتے، خواہ وہ اسلام ہو یا مسیحیت، عیسائیوں کو یہودیوں کی ریشہ دوانیوں اور چیرہ دستیوں کا احساس اب ہو رہا ہے ۱۹۶۵ء میں پاپائے روم اور ان کی عالمی کونسل نے یہ شدید غلطی کی تھی کہ یہودیوں کو حضرت مسیحؑ کا خون (جو ان کے عقیدے کے مطابق یہودیوں کی گردن پر تھا) معاف کر دیا تھا اور بیت المقدس کو بین الاقوامی شہر بنانے کی تجویز قبول کر لی تھی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ کیتھولک چرچ اب اپنی غلطی کا احساس کر رہا ہے،

اس سیمینار میں تمام عیسائی فرقوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ بیت المقدس عربی شہر ہے، اور اسے یہودی بنانے یا تقسیم کرنے یا بین الاقوامی شہر قرار دینے کی کوئی اسکیم قابلِ قبول نہیں ہے،

سیمینار میں سب سے زیادہ دھماکہ خیز تقریر ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی کی تھی، ڈاکٹر اسمٰعیل فاروقی کا یہ جملہ بہت چبھتا ہوا تھا کہ یہودیوں کی کوشش یہ ہے کہ مسیحیت کو بھی یہودی کر دیا جائے، ڈاکٹر فاروقی امریکہ میں رہتے ہیں، انھوں نے امریکہ کے حالات کو سامنے رکھ کر یہودیوں کی چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں عیسائیوں کی بے بسی کی طرف حاضرین کی توجہ دلائی، عیسائی نقطۂ نظر رومانیہ کے نوجوان پادری موریس مورمانس نے پیش کیا،

قذافی صاحب خود ایک منفرد فلسفی ہیں، پہلے ہی دن کے اجلاس میں وہ جب یکایک تشریف لے آئے تو انھوں نے اپنی بحث کا آغاز اس سوال سے کیا کہ کیا ویٹی کن کی ریاست دین پر قائم ہے یا کسی خود ساختہ نظام پر؟ کرنل صاحب کے جواب کے لئے بشپ روسامن کھڑے ہوئے اور بولے پہلی بات یہ ہے کہ ویٹی کن کا نام دراصل اُن سات چٹانوں کے نام پر ہے جو روم کے اردگرد پائی جاتی ہیں، ویٹی کن اصل میں ایک قبرستان ہے جس میں ایک قدیس مدفون ہے، اور قدیس کی قبر ہی ویٹی کن کے قیام کی بنیاد بنی تھی، اسی بنیاد پر ویٹی کن کو مرکزیت کا درجہ دیا گیا، اسی چٹان پر قدیس پطرس کا مقبرہ بھی ہے، شاہ قسطنطین نے اس پر ایک بہت بڑا کلیسا تعمیر کر دیا، جو بعد میں مرکزی کلیسا کی حیثیت اختیار کر گیا، اس کی اہمیت اس کی تاریخی قدر و قیمت سے ہے، لیکن ازمنۂ وسطیٰ سے یہ پوپ کا مرکز بن چکا ہے، اور اسے بین الاقوامی اہمیت حاصل ہو گئی ہے، اس تشریح کے بعد ویٹی کن مروج معنی میں ریاست نہیں ہے، بلکہ ویٹی کن پوپ کی رہائش گاہ ہے، جسے بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے،

مثنوی نل دمن

از ڈاکٹر محمد طیب صدیقی، سی، ایم کالج دربھنگہ

مثنوی کو ہم فارسی شاعری کی ایجاد کہہ سکتے ہیں، عربوں کے یہاں رجز نگاری کا دستور تھا، اور رجز کو بڑی حد تک مثنوی سے مشابہت ہے، لیکن اسے باقاعدہ مثنوی نہیں کہہ سکتے ہیں،

مثنوی کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیری ہے، غزل اور قصائد اپنی تنگ دامانی، اور ردیف و قوافی کی سخت پابندیوں کی وجہ سے اس کی گنجائش نہیں رکھتے کہ ان میں ہر نوع کے طویل و بسیط مضامین پیش کیے جائیں، لیکن مثنوی میں اتنی وسعت ہے کہ جملہ انواع کے طویل و عریض مضامین اس میں حسن و خوبی کے ساتھ پیش کیے جا سکتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آج صنف مثنوی میں سیکڑوں تاریخی وقائع، اخلاقی مسائل، پند و نصائح کے دفتر اور رزمیہ و بزمیہ داستانیں محفوظ ہیں، انہی بزمیہ داستانوں میں فیضی کی مثنوی "نل دمن" بھی ہے جو عشقیہ داستانوں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے فیضی کی مثنوی ایک خاص انفرادیت کی حامل ہے، اسکی عالمانہ بصیرت اور زبان و بیان پر قدرت و مہارت نے اسے انداز بیان کی ندرت اور حسن الفاظ کا امتیازی خلعت بخشا ہے، استعارات و تشبیہات کی شوخی، تخیل و محاکات کی دل آویزی، الفاظ و تراکیب کی تراش و خراش اور ان کی دروبست اور بندش کی چستی کی بنا پر ہر جگہ "کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست" کا عالم نظر آتا ہے، یہ بات درست ہے کہ فیضی نے نفس مضمون کی ترتیب اور کہانی کی تعمیر

پر مناسب توجہ نہیں کی ہے، لیکن انداز بیان کی ندرت و شوخی سے اس نے اس کمی کی بڑی حد تک تلافی کر دی ہے، اور سچ پوچھیے تو اس نقص کا ذمہ دار فیضی سے زیادہ اس عہد کے مذاق کو قرار دینا چاہیے جس میں انداز بیان ہی سب کچھ سمجھا جاتا تھا، ہو سکتا ہے کہ فیضی کو اس روایت سے بغاوت کی جرأت ہو سکی ہو یا یہ کہ زمانے کے مذاق کے مطابق اسے اپنی اس خامی کا احساس نہ ہوا ہو،

نل دمن کی اصل عشقیہ داستان کی تاریخ تصنیف اور اسکے مصنف کے حالات زندگی کے سلسلہ میں تاریخی یادداشتیں خاموش نظر آتی ہیں، ہندوؤں کی مذہبی کتاب مہابھارت کو اس قصہ کا قدیم ترین ماخذ سمجھا جاتا ہے، فیضی نے اس مثنوی کی بنا اسی قدیم قصہ پر رکھی ہے، صاحب تاریخ فرشتہ نے اس مثنوی کے ماخذ کے متعلق اپنے خیال کا یوں اظہار کیا ہے۔

"در کتب ہند کہ پیش از یں بہ پنج ہزار سال تصنیف شدہ مسطور است کہ قدیم الایام شہر بیدر پایۂ تخت رایان دکن بود .... و راجہ بھیم سین کہ بغایت شجاع و دانا و عادل و سخی بود از رایان مشہور شہر بیدر است و راجہ نل مالوہی غائبانہ بر دختر راجہ بھیم سین کہ دمن نام داشت عاشق شدہ، و قصۂ عاشقی و معشوقی ایشاں در ہندوستان مشہور است و شیخ فیضی شاعر بہ موجب حکم جلال الدین محمد اکبر شاہ داستان ایشاں را بہ نظم در آوردہ آں را نل دمن نام کردہ"[1]

فیضی نے شاہی حکم کے مطابق نل دمن کی محبت و عشق کے اس جگر گداز قصہ کو نظامی گنجوی کی لیلیٰ مجنوں کے طرز پر انتالیسویں سال جلوس یعنی ۱۰۰۳ھ میں نظم کیا ہے، اس مثنوی کی تکمیل کے وقت اس کی عمر انچاس سال تھی، چنانچہ وہ خود کہتا ہے

[1] تاریخ فرشتہ جلد اول ص ۳۲۵،

اکنوں کہ چہل و نہم در بن دیر — ہفتاد دو شعبہ کردہ ام سیر
سی و نہم از جلوس شاہی — تاریخ مجدد الٰہی،
چوں سال عرب شمار کردم — الف و سہ الف نگار کردم

اس عظیم الشان کارنامہ کی مدت تکمیل کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے ایک طبقہ کا خیال ہے کہ یہ مثنوی چار ماہ کی مدت میں انجام پذیر ہوئی،[1] دوسرا طبقہ جس نے اس کتاب کی مدت تکمیل پانچ ماہ قرار دی ہے، منتخب التواریخ کو بنیاد بنایا ہے، حالانکہ خود بدایونی اس مسئلہ پر پورے وثوق کے ساتھ اپنے خیال کا اظہار نہیں کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:۔

"در مدت پنج ماہ کم و بیش نل دمن را .... مرتب ساختہ"[2]

اس صورت میں پانچ ماہ والی روایت کی اہمیت کم ہو جاتی ہے، نتیجۃً چار ماہ والے قول کو معتبر سمجھا جائے گا،

ملا عبد القادر بدایونی اور صاحب تذکرہ سرو آزاد نے اس مثنوی کے اشعار کی تعداد چار ہزار دو سو لکھی ہے،[3] حسین قلی خاں عظیم آبادی نے بھی اس کی تائید کی ہے، مدیر معارف سید صباح الدین عبد الرحمٰن نے بھی بزم تیموریہ میں یہی خیال ظاہر کیا ہے،[4]

اس کے برخلاف شیخ ابو الفضل، محمد حسین آزاد اور مولانا شبلی نعمانی وغیرہ کا خیال ہے کہ مثنوی نل دمن میں صرف چار ہزار اشعار ہیں، ڈاکٹر ریو نے بھی ابو الفضل کے اکبر نامہ کی بنیاد پر اس مثنوی کے اشعار کی تعداد چار ہزار قرار دی ہے، ان حضرات نے ثبوت کے

۱؎ اکبر نامہ جلد سوم ص ۶۶۲ - ۶۶۱ دربار اکبری ص ۳۷۱ ۲؎ و ۳؎ بدایونی جلد دوم ص ۳۹۶، ۴؎ سرو آزاد ص ۳۰ ۵؎ بزم تیموریہ ص ۷۶،

طور پر فیضی کے اس شعر کو پیش کیا ہے، ؎

ایں چار ہزار گوہر ناب — کانگیختہ ام بہ آتشیں آب

لیکن خود شاعر کے ایک دوسرے شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شمار حتمی نہیں تھا، اور بہت سارے اشعار نظر انداز کر دیئے گئے تھے، چنانچہ کہتا ہے، ؎

مگر بیشتری نثار کردم — بے کسر درو شمار کردم

اشعار کی تعداد کی تعیین کے سلسلے میں بدایونی کا قول زیادہ معتبر قرار دیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس کے قول کی تائید خود فیضی کے کلام اور نل دمن کے مخطوطہ و مطبوعہ نسخوں کے اشعار کی تعداد سے ہو جاتی ہے،

فیضی کی تصانیف میں نل دمن کو بہت زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے، اپنی نادر تشبیہوں، نازک استعاروں، زبان کی شوخی اور بیان کی دل کشی نے اس مثنوی کو ایک ایسی جگہ پیدا کر دی ہے جہاں تک امیر خسرو کے بعد شاید ہی کسی اور کی رسائی ہو سکی ہو،

بدایونی عقیدے کے لحاظ سے فیضی کے سب سے بڑے مخالف ہیں، مگر جہاں اس کے علمی کارنامے کے ذکر کا موقع آتا ہے، اس کی خوبیوں کے اعتراف سے دریغ نہیں کرتے ہیں، چنانچہ مثنوی نل دمن کے بارے میں ان الفاظ میں اظہار خیال کرتے ہیں:۔

"الحق مثنوی است کہ دریں سہ صد سال مثل آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نگفتہ باشد"[1]

ابو الفضل کا بیان ہے کہ

۱؎ بدایونی جلد سوم ص ۲۹۹،

"نل دمن چناں گفتہ کہ انگشت حیرت زیر دنداں صاحبان طلاقت ماندہ واز شیرینی
الفاظ و نکات معنی لب بلب ارباب ذلاقت بہم چسپیدہ"[1]

صاحب مرأۃ الخیال اور حسین قلی خاں عظیم آبادی صاحب تذکرہ نشتر عشق نے بھی اس مثنوی کے بارے میں اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں،

محمد حسین آزاد کا خیال ہے کہ فیضی کو چونکہ فارسی اور سنسکرت ہر دو زبانوں اور ان زبانوں کی طرز ادا سے پوری واقفیت حاصل تھی، اس لئے وہ ایسے عظیم الشان علمی کارنامے میں کامیاب ہوا،

---

[1] اکبر نامہ جلد اوّل ص ۹،

سلسلہ شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ اس کے تدریجی ارتقاء اور عہد بعہد کے ممتاز فارسی شعراء کے حالات و سوانح اور ان کے کلام پر مبسوط تبصرہ، جو پانچ حصوں پر مشتمل ہے، اسکا چوتھا حصہ اس سلسلہ کا شاہکار ہے، اسی کے ایک حصہ میں مولانا نے فیضی کے کلام اور اس کی مثنوی نل دمن وغیرہ پر بہت تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، مولانا کے فارسی کے منتخب شعراء میں ایک ہندوستان نژاد فیضی بھی تھا، جو دربار اکبری سے وابستہ اور اس کے نورتن میں شامل تھا،

شعر العجم حصہ اوّل: عباس مروزی سے نظامی تک کا تذکرہ اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ قیمت ۱-۹۵

" دوم: خواجہ فرید الدین عطار سے حافظ ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام قیمت ۵-۵۰

" سوم: فغانی سے ابو طالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام، قیمت ۲۵-۶

" چہارم: شاعری کے انواع و اقسام و اصناف میں مثنوی خصوصاً شاہنامہ فردوسی پر بسیط تبصرہ، قیمت ۸۰-۷، پنجم: غزل، قصیدہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ۸۰-۷

مرتبہ مولانا شبلی نعمانی "منیجر"

آثارِ علمیہ و ادبیہ

مشاہیر کے خطوط

"معارف میں مشاہیر کے خطوط اکثر چھپتے رہے ہیں، ابھی غیر مطبوعہ کافی تعداد میں موجود ہیں جو وقتاً فوقتاً ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے شائع کئے جاتے رہیں گے، اُن میں سے چند آج شریکِ اشاعت ہیں"

از مولانا ابوالکلام آزادؒ
بنام مولانا شبلی نعمانیؒ

(۱)

۳۴ میڈل روڈ، انٹالی، کلکتہ،

۲۶ر اگست ۱۹۰۶ء

خواہی کہ بتو بیش شود شوق نظیری
از بیش خودش گاہ بر آں گاہ نظر دار

آقائے من! آج پرانے کاغذات میں لفافے ڈھونڈ رہا تھا، آپ کے چند خطوط اور کارڈ نکل آئے، میں پھر ایک مرتبہ اسی تمنازار میں پہنچ گیا، جہاں کسی کی نگہ ارادت نوازِ مایۂ حیات تھی، والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے، اخبارات میں بھی تذکرہ آچکا ہے، مگر آپ نے تعزیت کی ایک سطر بھی نہیں لکھی۔

دل ارادت و عقیدت سے اسی طرح لبریز ہے جیسا کہ پہلے تھا، اور ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گا

از طورِ صلح و عربدہ بیگانہ ام ہنوز

برآتشے نتاختہ پروانہ ام ہنوز

معلوم نہیں آپ کہاں ہیں؟ حافظ عبدالرحمٰن راوی تھے کہ عرصہ تک آنے کی امید نہیں

بہرکیف میں تو جہلم کے بعد بمبئی پہنچتا ہوں، اور وہاں سے جہاں آپ ہوں،

دل نے ملا دیں خاک میں سب وضعداریاں

جوں جوں رُکے وہ ملنے سے ہم بیشتر ملے

ابوالکلام

(۲)

حضرت مولانا شبلی مدفیوضہ

حضرت! میری صلحت دید تو یہ ہے کہ کہیں نہ جایئے لکھنؤ میں رہیئے، حج کی دو صورتیں ہیں، ایک تو للعوام کہ تلاشِ کعبہ بحر و بر ہا طے می کنند، اور دوسرا حج خواص کہ جب ضرورت ہوتی ہے کعبہ کو طلب کر لیتے ہیں، ابراہیم بن ادہم ہر ہر قدم دو رکعت نماز کرد چوں قریب کعبہ رسید نیافت. ندائے غیبی بگوش رسید کہ برائے استقبال رابعہ بصری رفت آپ کا درجہ اس سے بلند ہے، کہ کعبہ کی تلاش میں دشت پیمائی کریں، ہاں اجرام سماوی کا مطالعہ اور فکر فی خلق السمٰوٰتِ وَالارض، تو گو لکھنؤ میں بیت المقدس جیسی کوئی ٹیلسکوپ اور دوربین نہیں اس لئے اجرام بعیدہ کا مطالعہ بے عذر لیکن تاہم اگر علم ہیئت کے ابتدائی مراتب کی تحقیق منظور ہو تو شہاب ثاقب کے اجزاء کی تفرید و تحلیل کیجئے، ایسا نہ ہو کہ بابِ حرم سے ۱۶ ق کی طرح سنبا ہے

تو بروں درچہ کردی کہ

مکلوڈ اسٹریٹ کلکتہ ۱۱ را کتوبر ۱۹۱۰ء

(۳)

بنام مولانا سید سلیمان ندوی رح

۲۲ را کتوبر ۱۹۱۰ء　　۱۳ ر مکلاوڈ اسٹریٹ کلکتہ

مکرمی! میں تو اخبارات دیکھتا نہیں، اتفاق سے آج جبل المتین کے یہاں مشرق نظر سے گذرا، آپ کی تحریر تاریخ اسلام داخلِ نصاب کی نسبت پوری پڑھی، جی خوش ہوا، کہ آپ کام کر رہے ہیں، حالانکہ مولانا کو خوف تھا کہ کام نہ ہوگا، لیکن اس کے لئے لوگوں سے اپیل کرنے کی ضرورت نہیں، ندوہ کو براہ راست یونیورسٹی سے خط و کتابت کرنی چاہئے اگر ممبران سنڈیکیٹ اور فیلوز کچھ مفید ہو سکتے ہیں، تو اسے بھی اخبار میں لکھنے کی ضرورت نہیں، ندوہ کی طرف سے خط و کتابت کرنی چاہئے،

ابوالکلام آزاد　　دہلوی

(۴)

بنام مولانا مسعود علی ندوی ؒ

صدیقی العزیز،　　آپ ذوقِ سلیم کا ذکر کرتے ہیں، آپ کو کیا معلوم، یہ جلد کس عالم میں چھپی ہے، اور کیونکر میں نے اس کی اشاعت گوارا کی ہے،

نواگراں نخورند گز ندراچہ خبر

جلد دوم کی طباعت کی نسبت　　تفصیلات ہیں، جو بعد کو لکھوں گا، اگر آپ کے یہاں انجن ہے، تو آپ بآسانی بڑی تعداد میں چھاپ سکتے ہیں،

ترجمان القرآن کے پچاس نسخوں کے لئے کہہ دیا ہے،　　والسلام علیکم

ابوالکلام　　دہلی ۴ر فروری ۳۲ء

(مزید) آپ کے ذوق و فکر سے یہ بات بہت بعید تھی کہ کلکتہ کارپوریشن کی ایلڈرمین شپ پر مجھے مبارکباد دیں، جو شخص اس کے میئر شپ پر راضی نہ ہوا وہ یہ خرافات کب منظور کرسکتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے بعض مسلمانوں نے محض اس خیال سے کہ ہندو کانگریسی انکار نہ کرسکیں میرا نام پیش کر دیا تھا، میں بھلا اس لغویت کے لئے کب آمادہ ہوسکتا ہوں[۵]،

(۵)

از ڈاکٹر ذاکر حسین رحؒ[۵]

بنام مولانا مسعود علی ندویؒ

مخدوم و محترم - السلام علیکم،

عنایت نامہ شرف صدور لایا، امیر جامعہ کے نام آپ کا خط بھی ملا، امیر جامعہ جب بھوپال سے واپس تشریف لائیں گے، تو اُن کی خدمت میں پیش کر دوں گا، میں بہت ڈر رہا تھا کہ نہ معلوم اس معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہو، لیکن اب اطمینان ہوگیا: اب تک نسیم صاحب اور عبدالماجد صاحب دریابادی کی تحریری رائیں موصول ہوئی ہیں، اور وہ دونوں بھی آپ سے متفق ہیں،

گاندھی جی سے آپ کو جو شکایت ہے وہ اس خاص ہمدردی کی وجہ سے ہے، جو آپ کو ہم لوگوں کی پریشانی سے ہے، لیکن میرا خیال ہے کہ آپ اگر مفصل حالات پر مطلع ہوں تو یہ شکایت نہ رہے، بہرحال وہ آپ کا اور گاندھی جی کا معاملہ ہے، میں اس میں کیوں پڑوں

---

[۵] ترجمان القرآن جلد اول کے سلسلے میں اصل خط ہے ایلڈرمین ہونے کی خبر پھیل گئی تھی، آخری حصہ اسی کے متعلق ہے [۵] یہ بڑا اہم تاریخی خط ہے، حکیم اجمل خاں کا انتقال ہوگیا تھا، اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری اُن کی جگہ امیر جامعہ تھے اور جامعہ کے پرانے نظام کو تبدیل کرکے نئی تشکیل پر غور ہو رہا تھا مولانا مسعود علی جامعہ کے اہم رکن تھے۔

البتہ میری طرف سے یقین مانئے کہ بدسلیقگی بالکل نہ ہوگی، میری تجویز میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے جامعہ کی ماہیت کو بدلنا لازم آئے، تجویز صرف یہ ہے کہ موجودہ اُمنار دستکش ہو کر جامعہ کو ایک اور جماعت کے سپرد کر دیں، جس میں وہ لوگ ہوں جو جامعہ میں عرصہ دراز تک خدمت کرنے کے لئے آمادہ ہوں اور اس کے واقعی سچے مددگار ہوں، اس سے نہ کالج کا ٹوٹنا ضروری ہوتا ہے نہ اسکول کا، ہاں اگر روپیہ کی کمی کی وجہ سے ساتھی کم رہ گئے، تو البتہ کام میں تخفیف کرنی ہوگی، لیکن اس بارہ میں آپ نے جو کچھ الہ آباد میں فرمایا تھا، وہ مجھے یاد ہے اور انشاءاللہ جامعہ نہ ٹوٹے گی، اور نہ اس کی جگہ کوئی نئی چیز بنانے کی کوشش کی جائے گی، جامعہ تقریباً اسی طرح چلے گی جس طرح اب تک چلتی رہی ہے ممکن ہے آئندہ گزشتہ سے بہتر کام ہوسکے، اس سال کالج کی جماعتیں، اور اسکول کی برابر جاری رہیں گی، بشرطیکہ شوکت صاحب جلسہ میں آکر یہ نہ کہہ دیں کہ اساتذہ کو صبر کرنا چاہیے، ایثار کرنا سیکھو، قربانی کرو، روپیہ کتنا لوگے، میں دوں گا، یہ باتیں اب کب تک سنیں ہمیں دماغ نہیں خندہ[۱]........شاعر کہہ گیا ہے، اگر شوکت صاحب نے یہ طے کرالیا، اور بہت ممکن ہے کرالیں کہ جامعہ موجودہ اُمنار کے ہاتھ ہی میں رہے، اور وہ چار ماہ دورہ فرماکر ایک لاکھ روپیہ بھیج دیں گے، تو میں اس وعدہ کو صحیح باور کرنے پر تیار نہیں، اور نہ اس صورت میں اپنے ساتھیوں سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ کھانے کپڑے پر یہاں پڑے رہیں، اور نہ ایسی حالت میں خود ایسا کرنے کو جی چاہتا ہے،

بہرحال آپ کو اطمینان دلانا چاہتا ہوں کہ جامعہ کو نہ توڑنے کی نیت ہے نہ کسی نئی چیز کے بنانے کی خواہش صرف یہ ہے کہ موجودہ اُمنار دستکش ہوجائیں، اُن کی جگہ جو جماعت

---

[۱] غالب کا پورا شعر یوں ہے:-

غم فراق میں تکلیف سیر باغ نہ دو　　مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

جامعہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے، اس کا نام مجلس تعلیم ملی ہو، یا کوئی اور نام! فرض کیجئے "تنبیہ الغافلین" اس کے ارکان وہ لوگ ہوں جو یا تو جامعہ میں کچھ قربانی کر کے درس کا کام کریں یا اپنا وقت یا روپیہ دے کر اس کی مدد کریں، بس اس کے آگے اور کچھ نہیں،

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے، سعید نے اب تک میرے خط کا جواب نہیں دیا مجھے سخت انتظار ہے، سید صاحب کی اس تمام معاملے کے متعلق کیا رائے ہے، اُن کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، نجیب صاحب، ریاست صاحب اور معین صاحب کی خدمت میں آداب، مولوی عبدالسلام صاحب کی خدمت میں بھی

کلب تو آپ جاتے ہی ہوں گے، حاضرین کی خدمت میں میرا سلام پہنچا دیجئے، بشرطیکہ کسی کو یہ خیال نہ ہو کہ پھر چندہ مانگنے آرہا ہے، یہ خیال شاید امیر جامعہ کے کسی عزیز کو آجائے خدا مغفرت کرے خوب شخص تھے،

والسلام

نیازمند ذاکر حسین ۱۹۲۰ء

(۶)

از مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ

بنام

مولانا سید سُلیمان ندویؒ

مکرمی دام مجدہم، السلام علیکم،

۴؍ مارچ کا لکھا ہوا خط پہنچا تفصیلی واقعات معلوم ہوئے، یہاں ملاقات کی حالت بذریعہ پریس شائع ہوتی ہے، اس پر لوگوں کو اعتبار نہیں ہے تاہم اس سے نفس واقعہ کا علم ہو جاتا ہے، کاش اس کو بھی مفصل تحریر فرما دیں، یہاں حالات متغیر ہونے کے بجائے عوام میں

تحریک ہے، مگر اعلیٰ طبقہ اسی طرح ساکن ہے،...................، صرف نواب[1] میمو نے بجت تنفری کی ہے، فاروق علی اور ارشاد علی صاحبان جو اعزہ مکرمی شوکت علی صاحب کے ہیں، قید کر دئے گئے ہیں، اور ابھی تک ان کی رہائی نہیں ہوئی ہے، عوام کا جوش نواب صاحب کے خلاف بڑھ رہا ہے، دیکھیں کیا ہوتا ہے،

اس وقت ہم لوگ ایک دستور العمل بنا رہے ہیں، کہ تمام تحریکیں جلسہ ہائے خلافت کی کس طرح عمل میں لائی جاویں، ہندو بھی شرکت کو تیار ہیں، ہم لوگ اخبارات سے سخت مایوس ہیں، ایک اور وفد کی تجویز ہو رہی ہے کہ جلد آپ لوگوں کی تائید کی غرض سے بھیجا جاوے اور ارادہ ہے کہ سمرنا میں بھی روپیہ لے کر جلد کسی معتبر وفد کے ذریعہ سے بھیجا جائے روپیہ وصول ہو گیا ہے، یہ بھی قصد ہے کہ ایک وفد ممالک اسلامیہ میں جاوے میں اور حکیم اجمل خاں تیار ہیں، کہ شام اور حجاز و یمن کے وفد میں خود جاویں، اور بھی فضلا آمادہ معلوم ہوتے ہیں آپ کے جوابات غیر کافی سمجھے گئے ہیں، مولوی ابوالکلام صاحب کا خط و تار بہت تردد آمیز آیا ہے، جس کی تفصیل ارسال ہے،

برادرم محمد علی صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا، ان کا خط مجھے راہ سے ملا تھا، ان کو نیز سید حسین صاحب و محمد حیات صاحب کو سلام مسنون فرما دیجئے، فقیر محمد عبدالباری یکم اپریل ۱۹۲۰ء،

از مولانا سید سلیمان ندویؒ

بنام نواب سید امیر حسن خاںؒ[1]

لندن ۲۴؍ مارچ ۲۰ء عزیز مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ مورخہ ۲۶؍ فروری یہاں ۱۸؍ مارچ کو ملا آپ لکھتے ہیں کہ اب تک ہمارے

---

[1] امیر حسن صاحب نواب علی حسن خان ابن نواب صدیق حسن خاں سابق ناظم ندوۃ العلماء کے صاحبزادے تھے،

پہونچنے کی اطلاع ہندوستان میں شائع نہیں ہوئی، کیونکہ ہوتی جس دن آپ خط لکھ رہے تھے عین اسی دن ہمارا جہاز دوبار انگلستان میں لنگر انداز ہوا،

ممبران ہاؤس آف لارڈس اور ہاؤس آف کامنس سے ملاقاتیں ہوئیں، یہ سب کچھ ہوا مگر اصل مقصود کا پتہ نہیں، کوئی ہمارے نقطۂ نظر سے واقعات پر نظر ڈالنے کے لئے آمادہ نہیں، ہندوستان میں یورپ کی بے تعصبی کی داستانیں بہت سنا کرتے تھے، مگر یہاں آکر وہ عقیدہ بدعقیدگی سے بدل گیا، یہاں کے مشرقی ارباب علم کی بے تعصبی اور مشرق پرستی کی بڑی دھوم تھی، وہ بھی دہل تہی ثابت ہوئی، پروفیسر مارگولیوتھ مصنف لائف آف محمد ترکوں کے سب سے بڑے علمی دشمن ہیں، ڈاکٹر آرنلڈ مصنف پریچنگ آف اسلام سابق پروفیسر علی گڑھ کالج جن کی تعریف سے ہمارے استاد مولانا شبلی نہیں تھکتے تھے، وہ بخاری کے حوالہ سے ثابت کرتے ہیں کہ سلطان خلیفہ نہیں،

غرض یہاں کے وزراء کو تو بہر حال پیام پہونچ گیا، وزیر ہند کی ملاقات کا حال آپ پڑھ چکے ہیں، اب وزیر اعظم کی ملاقات کا حال پڑھئے گا، ہمارے سوال اور اُن کے جواب میں وہی نسبت ہے جو آسمان اور ریسمان میں، بھئی اصل چیز طاقت ہے، یورپ اسی کو مانتا ہے،

آج کل یہاں ایکوتھ اور لائڈ جارج صاحب کی کشتی کی بڑی گرم بازاری ہے، لائڈ جارج صاحب سوشلزم یا اس کے ہیبتناک لفظ بولشوزم سے مقابلہ کرنے کے لئے ایک لبرل جماعت قائم کرنا چاہتے ہیں، مسٹر اسکوتھ اس کے مخالف ہیں.

دوکنگ مشن کو دیکھا انگریز و ہیم نو مسلموں سے ملاقات ہوئی، لندن میں ہر جمعہ کو اور دوکنگ میں اتوار کو اجتماع ہوتا ہے، کام کی صداقت میں کلام نہیں، مگر اس سے زیادہ روپیہ اور محنت درکار ہے، ایک دو دفعہ میں نے بھی نماز پڑھائی،

جناب نواب[1] صاحب قبلہ کی خدمت میں سلام مسنون، اچھے[2] صاحب کہاں ہیں، پتہ کوک کمپنی کا رہے، والسلام

از خواجہ عبدالواجد ندویؒ

بنام مولانا سید سلیمان ندویؒ

کانپور انتظامی پریس ۳ر جنوری ۱۵ء

سیدی وسندی

امید ہے کہ آپ پونا میں ہوں گے[3] ادھر مولوی مسعود صاحب کانپور آئے تھے، اور مجھ کو لکھنؤ لے گئے، اثنائے سفر و نیز لکھنؤ کی صحبتوں میں مولانا مرحوم کے مشن کے متعلق مفصل حالات معلوم ہوئے، نہیں کہہ سکتا کہ کس قدر مسرت اور تسلی ہوئی، یہ صحیح ہے کہ مولانا مرحوم اپنی بیش بہا تصانیف کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے، لیکن یہ حیات سرمدی مکمل اسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ان کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچے، خدائے تعالیٰ ہم لوگوں کے ارادوں میں استقلال اور اسباب حالات میں توفیق و سازگاری عنایت فرمائے،

سیرت شبلی کے متعلق مولوی حبیب الرحمن صاحب کی رائے سے مجھے بکلی اتفاق ہے، بلکہ میں اس پر اس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے لئے عام چندہ بھی نہ ہونا چاہئے، مگر یہ فرمائیے کہ آپ نے لکھنا بھی شروع کیا،

مولانا کی تصویر ضرور ہونا چاہئے مگر الہلال میں جو شائع ہوئی ہے، عمدہ نہیں، سنا تھا کہ اس تصویر کا عکس لینے کی کوشش کرنے والے تھے، جو عطیہ فیضی کے شوہر نے بنائی ہے، اس میں کہاں تک کامیابی ہوئی،

"خواجہ عبدالواجد"

---

[1] نواب سید علی حسن خاں مرحوم، [2] اچھے صاحب کا نام رشید الدین تھا، یہ نواب میر حسن صاحب کے ماموں تھے

[3] یہ خط اس زمانے کا ہے کہ مولانا شبلی کا انتقال ہو چکا ہے، اور دار المصنفین قائم ہو رہا ہے، سید صاحب ابھی دکن کالج میں تھے، مولانا مسعود علی ندوی اعظم گڈھ آگئے تھے، خواجہ صاحب کے پاس کانپور اپریس کے متعلق مشورہ کرنے گئے تھے،

وفیات

احمد زکی

از محمد عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق تحقیق دار المصنفین اعظم گڈھ

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کا دور ایک عالمگیر بیداری، تجدید اور ذہنی و عملی تہذیب و تثقیف کا دور ہے، تقریباً ہر زندہ قوم و زبان پر بدلے ہوئے حالات کا اثر پڑا اور کچھ ایسی شخصیتیں سامنے آگئیں جو نئے رجحانات اور جدید تقاضوں سے باخبر بھی تھیں اور ان کی اہمیت و ضرورت کی معترف بھی، عالم عرب جو عرصہ سے سیاسی خلفشار اور معاشرتی اضطراب و بے چینی سے دوچار تھا، دوسروں کی بہ نسبت ان حالات سے جلد متاثر ہوا، عربی ادب جو زمانہ سے جمود و تعطل کا شکار تھا، اس دور میں اس نے کئی ایسے نامور ادیبوں کو جنم دیا، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ عربی ادب کو نئی روح، اس کے قالب کو نئی جان اور اس کے چہرے کو نئی رونق بخشی، بلکہ ان کی بالغ نظری، جدت طرازی اور دور بینی نے دوسروں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کرلی، اور ان کے خیالات کی بازگشت دور دور سنائی دینے لگی، شیخ محمد عبدہ، علامہ رشید رضا، امیر شکیب ارسلان، مصطفیٰ لطفی منفلوطی، مصطفیٰ صادق الرافعی، معروف الرصافی، خلیل مطران، کرد علی، عباس محمود عقاد، احمد امین، حسن زیات جیسے نامور مفکروں اور ادیبوں سے یہ عہد جدید مالا مال ہوگیا، ان میں سے ہر شخص زبان و ادب، فکر و نظر، اسلوب و انداز اور گہرائی و گیرائی کے لحاظ سے منفرد و ممتاز حیثیت کا حامل ہے،

انھی ناموروں کی صف میں احمد زکی کا بھی شمار ہوتا ہے، جن کا ابھی گذشتہ سال انتقال ہوا ہے اور جنھوں نے اپنے سائنس آمیز مقالات و تصانیف کی وجہ سے عربی ادب میں ایسا مرتبہ حاصل کرلیا ہے جو محترم بھی ہے اور باوقار بھی،

اصلاً وہ سائنس کے عالم تھے، ان کی تعلیم کا بیشتر حصہ سائنسی علوم کی تحصیل میں صرف ہوا، ۱۹۱۹ء میں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے سائنس میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی اور پھر چند ہی برسوں کے بعد فلسفہ میں بھی لیورپول یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کرلیا، اس طرح وہ سائنس و فلسفہ دونوں میں اعزازی نمبروں کے ساتھ سندیں لے کر اپنے وطن مصر واپس آئے، اور پھر طویل عرصہ تک درس و تدریس کی زندگی میں لکچرر سے لے کر پروفیسر، ڈین اور پرنسپل تک کے عہدوں پر کام کرتے رہے، اس اثنا میں وہ مصر کے اعلیٰ سائنسی اداروں کے مشیر، شریک اور سربراہ کی حیثیت سے بھی اپنے فرائض انجام دیتے رہے، ۱۹۵۴ء میں سرکاری عہدوں سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ مکمل طور سے سائنسی و علمی بحث و تحقیق میں لگ گئے، اس طرح انھوں نے سائنس اور ادب کے بہترین امتزاج کی ایک مثال قائم کردی، مشہور عربی محقق ڈاکٹر عدنان خطیب نے لکھا ہے، احمد زکی ایسے اچھے سائنسداں تھے، جنھوں نے لوگوں کو سائنس کے احترام پر مجبور کردیا، ایسے صاحب فکر تھے جو قارئین کو اپنے نقطۂ نظر سے متاثر کر دیتے، ادیب اس درجہ کے کہ اپنا ایک اسلوب رکھتے تھے، اس کے ساتھ کمال یہ تھا کہ اپنے علم و فکر کو صحیح، سلیس اور عام فہم زبان میں پیش کرنے کی بے مثل قدرت رکھتے تھے، احمد زکی کے طرز تحریر کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ وہ دقیق و پیچیدہ سائنسی مسائل اور مشکل ترین معانی و مطالب کو ایسے صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرتے ہیں کہ سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی، ان کے یہاں علم کے وزن کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی ہوتی ہے، "قصۃ مکروب" اور "قصۃ الکیمیا" ان کی

ایسی ہی کتابیں ہیں جن میں قاری تجسس اور کھوج کی بھول بھلیوں میں بڑے اطمینان کے ساتھ ان کے ساتھ چلتا ہوا منزل تک جا پہونچتا ہے، "مع اللہ فی السماء" "مع اللہ فی الارض" "وحدۃ اللہ تتراءی فی وحدۃ خلقہ" اور "قدرۃ اللہ تتراءی فی بدیع صنعہ" جیسے سلسلۂ مضامین ان کی دقت نظری کثرت مطالعہ اور وسیع ثقافتی ذہن کے آئینہ دار ہیں، پیچیدہ ترین موضوع کو آسان الفاظ اور واضح ترکیبوں سے سلجھا دینے کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کی زندہ جاوید کتاب "فی سبیل موسوعۃ علمیہ" کا مطالعہ کیجئے،

انھوں نے مصر کے اعلیٰ علمی ادارہ "لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر" کے ایک ممتاز رکن کی حیثیت سے کئی کتابوں کو عربی قالب عطا کیا، مختلف اعلیٰ علمی مباحثوں میں شریک ہوئے، اور ملک کے چوٹی کے مجلوں میں بلند پایہ مضامین لکھے، ان کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں:
(۱) سلطۃ علمیہ (۲) بین المسموع والمقروء (۳) مارجرت او غادۃ الکیمیا (۴) قصۃ المکروب (۵) قصۃ الکیمیا (۶) جان دارک (۷) واقف حاسمۃ فی تاریخ العلم (۸) مع اللہ فی السماء (۹) فی سبیل موسوعۃ علمیہ (۱۰) مع اللہ فی الارض، وہ صاحب طرز ادیب تو تھے ہی اس کے ساتھ نئے الفاظ جدید اصطلاحات اور انوکھی ترکیبیں بھی بے تکلف استعمال کرتے تھے، اور اس بارہ میں کسی کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے تھے، "العلم وراء السواد بین الناس" جو جیمز کونانٹ کی ایک کتاب کا ترجمہ ہے اسکے مقدمہ میں انھوں نے اپنے مسلک کی وضاحت بڑی جرأت کے ساتھ کی ہے، وہ لکھتے ہیں "رہی بات ترجمہ کی تو میں نے اس میں آزادی و آزادروی کا مسلک اختیار کیا ہے، اور نفع و افادہ کو ترجیح دی ہے، ایسی کتاب کے لئے جو سائنسی مضامین پر مشتمل ہو الفاظ کی نئی ساخت اور جدت و اختراع ضروری ہے، چنانچہ میں بھی اس بدعت کا مرتکب ہوا ہوں، ہاں انگریزی سے مانوس و واقف قارئین

کے لئے قوسین میں اصل انگریزی الفاظ بھی لکھ دیتے ہیں، یہ کتابیں صرف اپنی جدت اسلوب کے لحاظ سے ہی ممتاز نہیں، بلکہ احمد زکی کی تعلیقات اور ان کے گہرے علم سے لبریز حاشیوں کی وجہ سے بڑی قیمتی اور بلند پایہ ہو گئی ہیں، یہ حاشیے فروعی مسائل سے متعلق ہوتے ہیں، مگر مولف کے مسلک اور اس کی اخذ و قبول کے اصول کو بھی نمایاں کر دیتے ہیں، عنوانوں کے انتخاب میں بھی ان کا ایک خاص ذوق ہے، "مواقف حاسمہ فی تاریخ العلم" اسی ذوق کا آئینہ دار ہے،

وہ ۴۲ء میں عالم عرب کی ممتاز ترین علمی اکیڈمی المجمع العلمی دمشق کے ممبر منتخب ہوئے، اسی اکیڈمی کے ایک اجلاس میں جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا مشہور ادیب احمد امین نے کہا تھا "احمد ایک نامور ماہر کیمیا اور ایک بلند پایہ ادیب ہیں، انھوں نے سائنس اور ادب کو باہم شیر و شکر کر دیا ہے، حق یہ ہے کہ وہ سائنسدانوں میں ادیب اور ادیبوں میں سائنسداں ہیں، کبھی لیبوریٹری میں نلکیوں اور محلولوں میں سر کھپا رہے ہیں اور کبھی اپنے کتب خانہ میں الفاظ کی تحلیل و تجزیہ میں مشغول کسی اصطلاح کو عربی رنگ دیتے اور اپنے نتیجۂ تحقیق کو ادبی جامہ پہناتے نظر آتے ہیں" قدیم سے اختلاف کے باوجود وہ افراط و تفریط کا شکار کبھی نہ ہوئے، بلکہ ان کے اور کارناموں کے ساتھ یہ کارنامہ بھی یاد رکھا جائیگا کہ نشر و اشاعت کے ذرائع میں اُنھوں نے سختی کے ساتھ عربی قواعد اور صحیح عربی اسلوب کے اختیار پر زور دیا، خبروں کی نشریات میں خاص طور سے انھوں نے غیر فصیح الفاظ کے استعمال پر روک لگوائی،

احمد زکی عربی صحافت سے تقریباً ہمیشہ وابستہ رہے، ایک زمانہ میں وہ "الرسالہ" اور "الثقافہ" جیسے بلند ادبی رسالوں کی مجلس ادارت میں شریک، اور "الہلال" کے اڈیٹر

رہے، لیکن صحیح معنوں میں ان کے سائنس آمیز ادبی شہ پاروں و شہ کاروں کو پیش کرنے کا
فخر عالم عربی کے مشہور رسالہ "العربی" کو حاصل ہوا، یہ رسالہ جو آج ۴ لاکھ سے بھی زیادہ تعداد
میں ہر ماہ شائع ہوکر تمام عالم عرب میں پھیل جاتا ہے، احمد زکی کی ادارتی صلاحیتوں اور ان
کی اعلیٰ قابلیتوں کا حسین ترین نمونہ ہے، کویت کا ملک جب نیا نیا قائم ہوا، تو اس کی حکومت
نے ایک ایسے رسالہ کے اجراء کی تحریک کی جو باوجود اختلاف بلاد عربیہ کے ہر حلقہ میں قبولیت
حاصل کر سکے اور جس کا واحد مشن عربی زبان کی تحسین و تزئین اور ترویج و اشاعت ہو، ایک
ایسا رسالہ جو قدیم اقدار کے ساتھ جدید علوم و نظریات کا بھی حامل ہو، اعلیٰ مقاصد کے
حامل اس رسالہ کے لئے کسی ایسی ہی شخصیت کی ضرورت تھی، اور ظاہر ہے احمد زکی
سے بڑھ کر اس وقت کون سی ایسی شخصیت تھی چنانچہ حکومت کویت کی نظر انتخاب ان پر
پڑی اور پھر "العربی" اور احمد زکی ایسا ایک جان دو قالب ہو گئے، ایک کے بغیر دوسرے کا تصور مشکل
تھا، احمد زکی نے دسمبر ۵۸ء میں العربی کے پہلے اداریہ جس نے بعد میں "عزیزی القاری"
کے عنوان سے ایک مستقل شکل اختیار کر لی لکھا تھا "ہم نے اس رسالہ کا نام العربی رکھا ہے،
وطن عزیز کے ہر شخص کے ذہنی افق پر ابھرتے ہوئے نئے معانی و مطالب اور قلب کی گہرائیوں
میں جنم لیتی ہوئی آرزوؤں اور تمناؤں کو واقعی اور حقیقی انداز میں پیش کرنے کے لئے اس لفظ
سے مختصر اور مکمل لفظ اور کون ہو سکتا ہے، انھوں نے یہ بھی لکھا تھا، العربی خالص عربی فکر کا
ترجمان ہے، وہ وسیع معنی میں جہل کے برعکس علم کا مرادف ہے، وہ مرض کے خلاف صحت
کا رفیق ہے، وہ فقر کا دشمن اور ثروت و غنا کا دوست ہے، وہ ایسے پُرخلوص عمل کا داعی ہے
جس میں اعلیٰ تعلیم، وسیع ثقافت اور سچی لگن کی روح کارفرما ہو، تب ہی یہ عمل ایک
خوش حال و باوقار زندگی عطا کر سکے گا، عمل انسانی معاشرہ کا حق ہے، جسے وہ اپنے

ہر فرد سے طلب کرتا ہے، تعطل و بے عملی قانون فطرت ہی کے نہیں قانون حیات کے بھی خلاف
ہے"، عربی دنیا کے مخصوص حالات کے پیش نظر العربی نے اپنے صفحات کو سیاست و
عقائد کے مباحث سے پاک رکھا، لیکن احمد زکی استعماری اور استبدادی قوتوں کی ریشہ دوانیوں
سے ہمیشہ اپنے قارئین کو باخبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے، عربوں کی شکست کے عوامل کا
وہ تجزیاتی مطالعہ کرتے، اور اظہار رائے میں کبھی کسی ملامت یا خوف کا خیال کرتے
العربی بدستور اپنے انداز پر قائم اور اپنی راہ پر گامزن رہا، ۲۰۴ شماروں کے بعد نومبر
۷۵ء کا شمارہ وہ آخری شمارہ تھا، جس میں احمد زکی نے اپنا آخری مقالہ سپرد تحریر کیا،
اور جس کا عنوان عربوں کی سیاسی صورت حال کے پیش نظر بڑا ہی معنی خیز تھا، عنوان تھا،
لوگ کہتے ہیں رحم و الفت دوستی اور محبت تو پرانی باتیں ہو چکیں، اب مصلحت سب پر
مقدم ہے، کیسی زبون خیالی ہے" العربی کے دو سو چار رسالوں میں ہر جگہ احمد زکی اپنے
وجود کا احساس دلاتے رہے، "عزیزی القاری" کے علاوہ نہ جانے کتنی نازک بحثوں
اہم معاملوں اور زندہ عنوانوں پر انھوں نے اظہار خیال کیا، ان کے انتقال سے عربی
زبان اپنے ایک بہت بڑے خادم سے محروم ہو گئی، جو ہر وقت اس کے لئے سینہ سپر رہا
کرتا، اور ایک خوبصورت جدید انداز میں عربی کے حسن کو نکھارنے کی کوشش کیا کرتا تھا

لہ مضمون بالا کے واقعات و سنین ڈاکٹر عدنان خطیب کے ایک مضمون سے ماخوذ ہیں، جو
المجمع العلمی العربی دمشق کے تازہ شمارے میں شائع ہوا ہے،

ادبیات

غزل

از جناب ڈاکٹر سلام سندیلوی گورکھپور یونیورسٹی

بدلا ہوا کچھ اب کی گلشن کا نظارا ہے
پھولوں نے محبت سے کانٹوں کو پکارا ہے

افسانہ در افسانہ، ہر شے کا نظارا ہے
شبنم ہے کہ موتی ہے موتی ہو کہ تارا ہے

کچھ کم نہیں گلشن سے سیرِ دلِ خوں گشتہ
وہ باغ تمہارا تھا، یہ باغ ہمارا ہے

از روے تحفظ تو، کانٹے کہیں بہتر ہیں
مانا کہ گلستاں کو، پھولوں نے سنوارا ہے

دل جوں ہی ادھر ٹوٹا غنچہ بھی ادھر چٹکا
میں نے بھی صدا دی ہے اس نے بھی پکارا ہے

بیگانہ سہی سبزہ، لیکن ہے گلستاں میں
گلشن کی زبوں حالی، کب اس کو گوارا ہے

اے غنچہ و گل رہنا، ہشیار ہواؤں سے
نرگس کا گلستاں میں، کچھ اور اشارا ہے

ہوگی نہ سلام اپنی، بجلی سے کبھی سازش
یہ پھول ہمارے ہیں، یہ باغ ہمارا ہے

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر صاحب بجنوری

حقیقت سے جو خالی ہوں وہ افسانے نہیں ہوتے
جنوں سے ہوں جو نامحرم وہ دیوانے نہیں ہوتے

دلوں کو جیت لیتی ہے محبت کی ہمہ گیری
محبت ہو تو بیگانے بھی بیگانے نہیں ہوتے

ترے قدموں میں عالم کی بہاریں رقص کرتی ہیں
جہاں تیرے قدم ہوتے ہیں ویرانے نہیں ہوتے

محبت میں گداز دل ہے پہلی شرط اے ہمدم
جنھیں جلنا نہیں آتا وہ پروانے نہیں ہوتے

جنوں کچھ اور ہے، دیوانگی کچھ اور ہے جوہر
سبھی اہلِ جنوں در اصل دیوانے نہیں ہوتے

مطبوعاتِ جدیدہ

عمدۃ اللبیب شرح شیم الحبیب (عربی) از۔ مولوی محمد نیاز صاحب میواتی، تقطیع کلاں، کاغذ کتابت و طباعت معمولی صفحات ۲۰۰، قیمت عـــہ پتہ مدرسہ عربیہ قاسم العلوم نوح پلہ، گوڑ گاؤں، ہریانہ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مبارکہ کی طرح آپ کی سیرت و اخلاق، طور طریقے، طبعی امور اور آپ کی زندگی کا ہر پہلو مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل ہے، اسی لئے علما نے شمائل نبوی پر مستقل کتابیں لکھی ہیں، ان میں امام ترمذی کی شمائل جو سب سے پہلے لکھی گئی تھی، زیادہ مشہور و مقبول ہے، شیم الحبیب بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے، جو تحریک تبلیغ و دعوت کے رہنما مولانا محمد الیاس اور شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب کے ایک خاندانی بزرگ وجید عالم مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی (م ۱۲۴۵ھ) کی تالیف ہے، مفتی صاحب حضرت شاہ عبد العزیز دہلویؒ کے نامور شاگرد تھے، اس میں زیادہ روایتیں شمائل ترمذی اور شفا قاضی عیاض سے جمع کی گئی ہیں، اس طرح یہ مختصر رسالہ آنحضور صلعم کے حلیۂ مبارک، اخلاق و معمولات، عادات و خصائل، رفتار و گفتار، نشست و برخاست، لباس و طعام اور ساز و سامان وغیرہ کا مرقع ہے، مولوی نیاز محمد صاحب نے اسکو مع شرح شائع کیا ہے، شرح میں مشکل الفاظ اور جملوں کی تشریح اور بعض مطالب کی توضیح کی گئی ہے، شروع میں مصنف و شارح کے حالات بھی درج ہیں۔

معاشرتی مسائل۔ مرتبہ۔ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی، متوسط تقطیع کاغذ کتابت و

وطباعت عمدہ صفحات ۲۲۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ/۱۳ روپے پتہ مجلس تحقیقات و نشریات
اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹، لکھنؤ

اسلام کے معاشرتی مسائل میں نکاح، طلاق اور وراثت سے متعلق بعض قوانین کو تجدد پسندوں
نے عرصہ سے اعتراضات کا نشانہ بنا رکھا ہے، اور ان میں اصلاح و ترمیم کا مطالبہ کر رہے ہیں،
زیر نظر کتاب میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے استاذ حدیث مولانا برہان الدین نے معترضین کے
اعتراضات کا جائزہ لیا ہے اور ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کو واضح کیا ہے، انھوں نے ان
مسائل کے متعلق تفصیل سے اسلامی تعلیمات بیان کی ہیں، اور ان کے حکم و مصالح کی تشریح کی
ہے، اس سلسلہ میں انھوں نے نکاح کے اسلامی طریقہ کا دوسرے مذاہب سے موازنہ کرکے اسکی
برتری و فوقیت ثابت کی ہے، آخر میں مسلم پرسنل لا میں اصلاح و ترمیم کے ایک پرزور حامی
جناب آصف علی فیضی کے ایک مضمون پر نظر ڈال کر ان کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے، ممکن ہے
کہیں کہیں مصنف کا طنز آمیز انداز علمی متانت کے خلاف سمجھا جائے لیکن یہ کتاب بڑی مدلل
ہے، اور محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے، شروع میں مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کے قلم سے ایک
فاضلانہ مقدمہ بھی ہے۔

حیات سید اشرف جہانگیر سمنانی - مرتبہ ڈاکٹر سید وحید اشرف کچھوچھوی استاد
شعبۂ فارسی واردو مہاراجہ سیاجی راؤ یونیورسٹی بڑودہ، تقطیع خورد، کاغذ کتابت و
طباعت بہتر صفحات ۱۲۲ مجلد مع گرد پوش قیمت عہ/ پتہ مولانا سید قدیر احمد کچھوچھوی
ضلع فیض آباد (۲) جی آر لال اکھاڑہ یاقوت پورہ، بڑودہ،

یہ آٹھویں صدی ہجری کے مشہور بزرگ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کی سوانح عمری ہے،
جس کو ان کے خانوادہ کے ایک صاحب قلم ڈاکٹر سید وحید اشرف نے تلاش و محنت سے مرتب کیا ہے،

یہ تیرہ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے سمنان کی مختصر تاریخ اور اس کے متعلق جغرافیائی معلومات تحریر
کیے گئے ہیں، پھر حضرت سید اشرف کے خاندان اور سمنان میں قیام کے زمانہ کے ابتدائی حالات
بیان کیے گئے ہیں اور ان کی پیدائش اور سنہ وفات کی تحقیق کی گئی ہے، نیز سمنان سے ہندوستان
آنے اور بنگال میں شیخ علاؤ الدین کی خدمت میں حاضری و بیعت اور شیخ کے ایما سے مستقل قیام
کے ارادے سے کچھوچھہ میں تشریف آوری اور ہندوستان کے مختلف علاقوں اور عالم اسلام
کی سیاحت اور ہر جگہ کے علما و مشائخ سے ملاقات کا ذکر ہے، ایک باب میں ان معاصر علماء
وصوفیا کا ذکر ہے جن سے حضرت جہانگیر کا افادہ و استفادہ کا تعلق رہا ہے، ایک اور باب میں
ان کے امراء و سلاطین سے تعلقات کا ذکر ہے، اس میں یہ بھی دکھایا ہے کہ وہ بعض دوسرے
مشائخ کے طرز عمل کے برعکس کیوں ان لوگوں سے روابط رکھنے کو معیوب نہیں سمجھتے تھے،
آخر میں شیخ کے زہد و عبادت، اخلاق و عادات، ان کی تصنیفات اور وفات کے زمانہ کے
بعض واقعات کا تذکرہ ہے، مصنف سید صاحب ہی کے خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں اس لیے
ظاہر ہے یہ سوانح عمری عقیدت سے لکھی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود بڑی حد تک مورخانہ طرز قائم
رکھنے کی کوشش کی ہے، اور ان ہی روایتوں کو نقل کیا ہے، جو ان کے خیال میں علمی و تحقیقی حیثیت
سے درست معلوم ہوئی ہیں، اس کتاب میں سید صاحب کے واقعات و حالات زندگی بیان
کرنے ہی پر اکتفا کیا گیا ہے، ان کے خلفاء اور تعلیمات پر ایک اور جلد لکھیں گے سید صاحب کے
واقعات کے ضمن میں اس زمانہ کے بعض اہم واقعات کا ذکر بھی آ گیا ہے، بابا رتن قطعاً صحابی نہ تھے،
محدثین اس قسم کی تمام روایات کی تردید کر دی ہے اسکے باوجود اس پر تامل کی کیا وجہ ہے؟ ص ۵۰ - اور میزان الاعتدال
اور تجرید اسماء الصحابہ کو حافظ ابن حجر کی تصنیف بتایا گیا ہے، حالانکہ یہ علامہ ذہبی کی کتابیں
ہیں، لیکن ان معمولی فروگذاشتوں کے باوجود کتاب اپنی ایک حیثیت رکھتی ہے، اور مصنف
کی محنت قابل تحسین ہے۔

اقبالی مجرم: مرتبہ جناب شورش کاشمیری کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، متوسط تقطیع،

قیمت تحریر نہیں، پتہ: ۸۰ میکلوڈ روڈ، لاہور، (پاکستان)

آغا شورش کاشمیری مرحوم علامہ اقبال کے پرستار اور انکے افکار و خیالات کے پرجوش مبلغ تھے اسلئے اقبال کے نکتہ چین اور غلط ترجمان اُن کے قلم کا خاص نشانہ تھے، اس کتاب میں انھوں نے اقبال سے متعلق عبدالمجید سالک کی ذکر اقبال کے ان حصوں کی تردید کی ہے جن میں اقبال کو قادیانیت کے معاملہ میں نرم ثابت کیا گیا ہے، پھر عابد علی عابد مرحوم کی شعر اقبال کے بعض مندرجات کی تردید کرکے بتایا ہے کہ اقبال کی شاعری اور فلسفہ کا اصل سرچشمہ قرآنی تعلیمات تھیں آخر میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی فکر اقبال کا تجزیہ کرکے یہ لکھا ہے کہ خلیفہ صاحب نے فکر اقبال کے بنیادی عناصر کو نظرانداز کرکے اقبال کے طائر فکر کو اپنے بال و پر دینے کی کوشش کی ہے، شروع میں اقبال سے متعلق پاکستانی مطبوعات اور وہاں انکے نام پر قائم کئے گئے اداروں کے اقبال کے افکار و نظریات کو توڑ موڑ کر شائع کرنے پر آہ و فغاں کی ہے، اور ان کو صحیح خطوط پر کام کرنے کا مشورہ دیا ہے،

مثنوی زہر عشق - مرتبہ - جناب امیر حسن نورانی صاحب تقطیع خورد، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۸۰، قیمت، عام اڈیشن عہ پیسے خاص اڈیشن ع پتہ مکتبہ شاہراہ اردو بازار دہلی،

اردو کی جن مثنویوں کو بڑی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی ان میں ایک نواب مرزا شوق لکھنوی کی زہر عشق بھی ہے جو اپنی سادگی و سلاست، حلاوت و روانی، سوز و گداز اور روزمرہ اور محاوروں کی صفائی کے لحاظ سے بے مثال خیال کیجاتی ہے، یہ متعدد بار چھپ چکی ہے اور اسکی خصوصیات پر بہت کچھ لکھا گیا ہے عرصہ سے کمیاب تھی، اس لیے لائق مرتب نے اسکو مختلف مطبوعہ اور قلمی نسخوں سے مقابلہ و تصحیح کے بعد اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ میں شوق کے حالات، شاعری اور صنف مثنوی پر مختصر تبصرہ کرنے کے بعد زہر عشق کے زمانۂ تصنیف کی تعیین اس کے اہم مطبوعہ نسخوں، ماخذ، قصہ، کردار اور خصوصیات وغیرہ پر گفتگو کی گئی ہے مقدمہ میں کہیں کہیں شوق اور انکی مثنویوں کے بارہ میں بعض غلط بیانات کی تردید بھی کی گئی ہے۔

"ض"

جلد ۱۱۹ ماہ ستمبر ۱۹۷۶ء مطابق ماہ رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ عدد ۳

مضامین